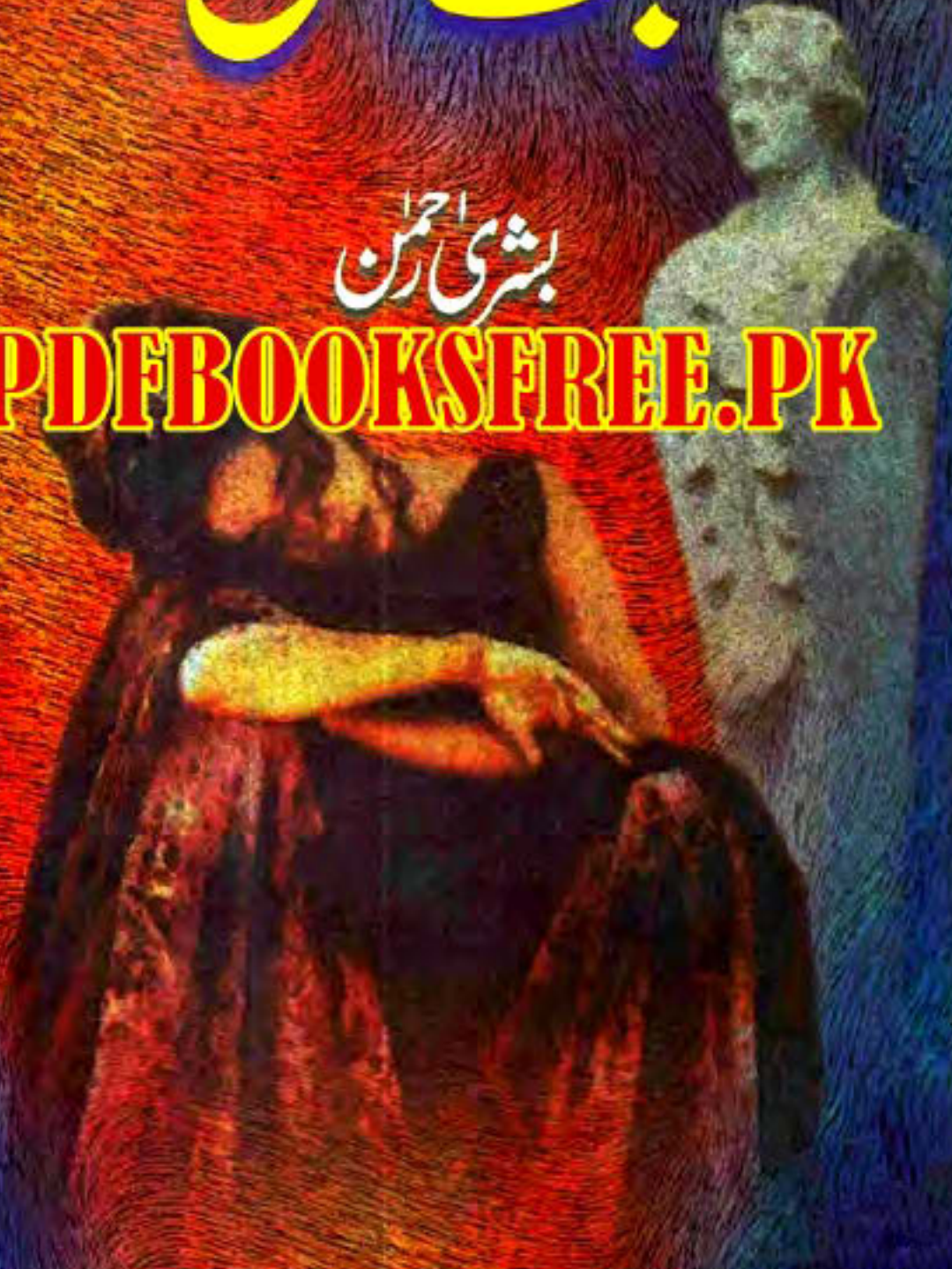


بہشت شکن

بشریٰ حرم

PDFBOOKSFREE.PK



”نہیں..... کچھ ایسا ضروری بھی نہیں..... میں تمہیں آخری وقت تک انتخاب بدلنے کا موقع دوں گا۔ میں شہزادہ گلغام نہ سہی..... پر کسی سے کم ہوں؟“ تو حید کے لہجے میں بازی جیت لینے والا سارا غرور تھا۔ مگر دلاؤ ویز اس کی بات سننے بغیر کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں جا چکی تھی۔

قطب صاحب! سامنے والے صوفے پر بیٹھے پائپ پی رہے تھے اتنے مودب اور مہذب کہ اپنے دیر سے آنے پر خواہ مخواہ اسے افسوس ہونے لگا۔ اسی لئے جلدی سے اس نے دوپٹے کا پلو اپنے کھلے بالوں پر لٹکایا اور قریب آ کر بولی:

”جی فرمائیے؟“

انہوں نے اٹھ کر سلام کیا، دو بارہ بیٹھے تو بڑی نرمی سے بولے:

”میں مسز بیگ سے ملنے آیا تھا، بے وقت آنے کی معافی چاہتا: وہ مگر بات ہی ایسی بوٹی تھی۔“

”مئی تو جی دو روز کے لئے اسلام آباد آگئی ہوئی ہیں۔“ اس نے ایک ہی فقرے میں اپنا تعارف کرا دیا۔

”اوہ..... مگر میرا نہیں آج ہی ملنا بہت ضروری ہے۔“

”ظہر ہیے..... میں آپ کی فون پر بات کرا دیتی ہوں۔“ دلاؤ ویز نے کوریڈور میں جا کر فون ملانے سے پہلے خانہ سالن کو چاٹے بنانے کے لئے کہہ دیا، اسلام آباد کی لائن ملی تو:

ادھر سے آواز آئی کہ: ”مسز بیگ کسی میننگ میں گئی ہوئی ہیں، شام کے چھ بجے واپس آئیں گی۔“

دلاؤ ویز نے قطب صاحب کو بتا دیا تو وہ بولے: ”مجھے ان کا فون نمبر دے دیجئے، میں شام کو خود ان سے بات کر لوں گا۔“

اس بات کی اطلاع بھی اسے پہلے دن تو حید نے ہی دی تھی، وہ ڈرائنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی اپنے لمبے ناخن پیرٹ سے صاف کر رہی تھی۔ وہ سیدھا اس کے کمرے میں آ گیا۔ اور اس کے سر پر کھڑا ہو کر بولا۔

”باہر کوئی قطب صاحب آئے ہیں؟“

وہ سر اٹھائے بغیر چمک کر بولی، اسے ہمیشہ تو حید کا بے چھجک کمرے میں چلے آنا برا لگتا تھا۔ حالانکہ یوں چلے آنے کا اسے حق تھا، مگر وہ کب کسی کے حق کو تسلیم کرتی تھی، وہ بھی اسی حاکمانہ موڈ میں بولا:

”میں کونسا کہہ رہا ہوں کہ ان سے نکاح پڑھوا لو..... مسز بیگ کے کوئی معزز مہمان لگتے ہیں۔ اس لئے تمہیں اطلاع دے رہا ہوں۔“

دلاؤ ویز نے ہاتھ میں پکڑا، دواروں کا پھوندا زمین پر پھینک دیا۔ پیرٹ کی شیشی بندی اور کھلے بالوں کو جھٹک کر کھڑی ہو گئی اور تو حید کی آنکھوں میں اپنی وحشی آنکھیں ڈال کر بولی:

”اوہو! تمہارے جیسے گلغام کے ہوتے ہوئے میں کسی اور سے نکاح پڑھواؤں گی۔“

تو حید نے اس کے طنز کو اچھی طرح محسوس کیا اور جیسے کڑوی گولی کھا کر منہ بناتے ہیں۔ اس طرح کا منہ بنا کر بولا:

نوکریاں کرتی تھیں اور گھروں میں بچوں کو سنہانے والا کوئی نہیں تھا۔ آغوش میں وہ معصوم بچے رکھے جاتے جن کی عمر ایک سال سے لے کر ڈھائی سال تھی، ظاہر ہے ان بچوں کو تعلیم کی نہیں توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے وہ شفیق سی نرمیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس نرسری کی دیکھ بھال وہ خود کرتی تھیں، بچوں کی خوراک کے چارٹ بھی خود بناتی تھیں، ان کو سونے کے وقت سلا یا جاتا اور کھیلنے کے وقت کھلایا جاتا۔

دوسرا شعبہ تھا ”نوپال“ اس میں ڈھائی سال سے لے کر ساڑھے تین سال کے بچے رکھے جاتے۔ بچوں کی یہ عمر بڑی نازک اور بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ ہر سوراخ میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ ہر چیز ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں۔ ہر چیز کو خود جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس شعبے میں بچوں کو غیر محسوس طریقے سے الفاظ کی پہچان کرائی جاتی یا آوازوں سے مانوس کیا جاتا۔

مزید بیک نے اس شعبے کے لئے ہر قسم کے خوفناک درندوں اور جانوروں کے ماڈل پلاسٹک میں بنوا لئے تھے۔ حتیٰ کہ سانپ، گھمرا اور چیونٹی کی صورتیں بھی بنوائی ہوئی تھیں۔ بچوں کو عادت ہوتی ہے وہ گھر میں لگے بجلی کے سوچے دبانے چاہتے ہیں یا پلگ میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں۔ بچوں کو تحس کو سیراب کرنے کے لئے نرسری بیک نے اس نرسری میں مصنوعی سوچے پلگ اور شوگر گوائے بنوائے تھے تاکہ بچے چھو کر اپنا تحس مٹا سکیں۔

نرسری کا تیسرا حصہ ”بوستان“ کہلاتا تھا۔ اس میں ساڑھے تین سال کی عمر سے لے کر پانچ سال کی عمر کے بچے رکھے جاتے اور ان کے ذہنی رجحانات کے مطابق ان کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع کروایا جاتا۔

پچھلے پانچ سالوں سے یہ سکول خوب اچھی طرح چل رہا تھا۔ مگر اب ماؤں نے مزید بیک پر دباؤ ڈال دیا تھا کہ وہ اسی سکول کو آہستہ آہستہ ہائی سکول کا درجہ دیں۔ انہیں اپنے

کاغذ تلاش کر کے نوں نمبر لکھنے آئے اور جانے میں چائے آگئی تو وہ انکسار سے بولی۔
”پلیز ایک کپ چائے پی کر جائیں۔“

قلب صاحب اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئے۔ شاید ضرورت مند تھے۔ یوں اسے وہ سارے سوال پوچھنے کی جرأت ہو گئی جو انتہائی غیر ضروری تھے۔

☆.....☆.....

مسفر زائدہ بیگ سدا سے تعلیمی اداروں سے وابستہ رہی تھیں۔ پہلے پہل لیچر تھیں پھر پروفیسر بن گئیں ایک وقت آیا کہ وہ پرنسپل ہو گئیں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انہیں وہ بارہ بلا یا گیا۔ ان کی اچھی کارکردگی اور ان تھک محنت سے حکومت انہیں چھوڑنے پر راضی نہ تھی مگر اب مسر بیگ نے اپنا ایک نرسری سکول بنالیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ماں کی گود چھوڑتے ہی بچوں کو ماں کی گود جیسے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم سے زیادہ ابتدائی تعلیمی اداروں کو سنوارنے کے حق میں تھیں ان کا خیال تھا اگر ابتدائی تعلیم و تربیت صحیح ہو تو مستقبل کے بچے بے مثال ہوتے ہیں۔ اب یوں تو گنگی گلی محلہ محلہ نرسری سکول کھل رہے ہیں۔ مگر ان سکولوں میں ذرا سی انگریزی اور تھوڑی سی نظمیں سکھائی جاتی ہیں۔

جبکہ مسر بیگ کا خیال تھا نرسری سکول یا ابتدائی سکول نارنج کی مانند ہوتے ہیں وہ بچے کے اندر اتنی دور تک روشنی پھیلتے ہیں کہ اس کے ذہنی رجحانات اور طبعی مایانات صاف انفر آنے لگتے ہیں مگر ہمارے ہاں اس کے الٹ ہوتا ہے۔ ابتدائی سچ پر سب کچھ رہا، اتنی انداز میں ہوتا رہتا ہے۔ آگے چل کر ہم لٹھ لے کر بچوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اسی خیال و جیش نظر رکھ کر انہوں نے ایک آئینڈیل مسر نرسری سکول کھولا تھا۔

جس کا نام تھا ”بوستان آرزو“ جس کے تین شعبے بنا رکھے تھے۔ پہلے شعبہ کا نام تھا ”آغوش“ یہ شعبہ خاص طور پر ان ماؤں کے لیے باعظ پرکشش تھا جو دن کے وقت

بچے دوسرے سکولوں میں داخل کراتے ہوئے بعد میں بہت کوفت ہوتی ہے۔ وہاں ایسے بندوبست نہیں ہوتے تھے نہ بچوں پر فردا فردا توجہ دی جاتی تھی۔

ویسے تو سز بیگ مالی طور پر اچھی آسودہ تھیں کہ ایسا سکول کھول سکتی تھیں۔ مگر انہیں اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے کچھ تخلص اور بے لوث خواتین کی ضرورت تھی۔ جب کچھ خواتین جذبے کے ساتھ سامنے آ گئیں تو انہوں نے فی الحال برائری تک کا شعبہ بڑھا دیا اور ہائی سکول بنانے کے لئے ایک عرضی بھی دے دی۔ ایسے سکول کے لئے انہیں گرانٹ کی بھی ضرورت تھی اسی خاطر انہیں اب اسلام آباد بلا لایا گیا تھا۔

مسز بیگ کو ہر محبت وطن خاتون کی طرح اپنے ملک کے بچوں سے بہت محبت تھی اور وہ علی الاعلان کہا کرتیں کہ اگر ملک کا ہر شہری اپنے وطن کو کوئی تحفہ دینا چاہتا ہے تو وہ اچھے شہریوں کی صورت میں دے سکتا ہے۔ اچھے شہری والدین کے لئے صدقہ جاریہ ہوتے ہیں اور وطن کا سرمایہ انکار.....

طلبا و اور طالبات کے لئے ان کے ذہن میں بہت سی تجاویز تھیں۔ جن پر وہ وقتاً فوقتاً روشنی بھی ڈالا کرتیں اور لوگوں کو اس میدان میں کچھ کرنے پر اکساتی بھی رہتیں۔ اسی لئے اکثر ان کا نام اخباروں کی زینت بنتا رہتا، مختلف کانفرنسوں میں وہ بلاوائی جاتیں، مہمان خصوصی بنائی جاتیں اور کتا بنچے لکھتی رہتیں۔ مگر ایک درد ان کے دل میں بھی پوشیدہ تھا۔ اس درد کو سز بیگ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

مسز فرزانہ بیگ جب ایک کالج میں لیکچرار تھیں تب ان کی ملاقات فاروق بیگ سے ہوئی تھی ایسی ملاقات شادی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ شادی ہو گئی دونوں میاں بیوی کو شوق تھا کہ ان کے بہت سے بچے ہوں مگر قدرت کی ستم نظری نے فرزانہ بیگ کے اندر جب نیا شگوندہ چھوٹا آٹھویں مہینہ اسقاط ہو جاتا۔ علاج کے ساتھ ساتھ بالآخر وہ تعویذ گنڈوں کا

سہارا لینے پر مجبور ہو گئیں۔ آگے پیچھے دو صحیح سلامت بیٹے پیدا بھی ہوئے ایک نے تو باہر آ کر فقط چند سانس لئے اور رخصت ہو گیا اور دوسرا کس دن زندہ رہا اور چل بسا..... نجانے ایسے کتنے صدے انہوں نے سہے..... اور کتنے دکھ اٹھائے بالآخر قدرت کو ان پر ترس آ گیا..... آخر میں ان کی ایک بیٹی پیدا ہوئی..... جس کے مرنے کا وہ بہت دن تک انتظار کرتی رہیں اس کو باہر بھی نہ لگاتیں پرے پرے رکھتیں جانے والی شے سمجھتیں..... مگر وہ ہمک ہمک کر کھیلتی رہی..... دور دور پلٹی رہی..... قریب قریب آتی رہی..... ابھی وہ اس خوشی کو سمجھتا تھا کہ ان کے محبوب شوہر دل کے دورے سے جا بھر نہ ہو سکے۔ اور ان کی زندگی میں ایک ابدی خلا چھوڑ گئے۔

تب سے انہوں نے دلا ویز کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنالیا تھا۔ یہ ان کے شوہر کا بدل تھی۔ جانئیں تھی یا دلئیں۔

مگر تب سے مسز بیگ کو معصوموں کے ساتھ ایک عجیب سی محبت ہو گئی تھی ننھے بچے انہیں بے حد اچھے لگتے، ان کا دل چاہتا..... ہر گھر میں ہر گود میں کھلنے والے ان بچوں کو پھولوں کی چھاؤں میں پالا جائے ان بچوں کی بہبودی کے لئے جو وہ سوچتی تھیں بالآخر کر کے دکھائی۔ اب تو ان کی بیٹی دلا ویز نے بی اے کر لیا تھا اور ماں کی خواہش پر بی نرسری سکول کی فریڈنگ بھی لے لی تھی اور ماں کے ساتھ مل کر سکول میں کام کرتی تھی، بلکہ مسز بیگ کی عدم موجودگی میں انتظامیہ کو بھی سنبھالتی تھی اور ایک ذمہ دار ماں کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس لئے بڑی ذمہ داری اور توجہ سے قطب صاحب کی تواضع کر رہی تھی اور دیر سے دھیرے ان کے آنے کی وجہ جان رہی تھی۔

”آپ کو اپنا بچہ داخل کرانا ہے؟“

کی ساری خوشیاں پیش کر دینے کو دل چاہتا ہے۔

دلّٰویز ڈرانگ روم سے باہر آئی تو بڑی چپ اور گم سم تھی ماہرینِ انجیٹات کہتے ہیں ایسے لوگوں سے مل کر بڑی کوفت ہوتی ہے۔ جو جاتے جاتے قوطیت اور ادا سیوں کے براہِ نیم چہرے جاتے ہیں۔ یہ قوطیت نہیں تھی۔ قوطیت یاویسیوں کو ختم دیتی ہے، لیکن اگر آسمان کے تیلے صاف شفاف کناروں پر سیاہ بدلیاں گھر گھر کر جمع ہو رہی ہوں تو دریا کے آئینہ صفت پانی میں ان کے عکس صاف نظر آتے ہیں۔ پانیوں میں بادلوں کے عکس بعض اوقات اداس کر دیتے ہیں۔

اتنے اونچے بادل اتنے نیچے پانی میں کیسے آ جاتے ہیں۔ زمین کو آئینے راس نہیں آتے، بارش کے بعد جب بھی دلّٰویز گھر سے باہر نکل جاتی۔ جگہ جگہ ٹھہرے ہوئے پانی میں اسے بادلوں کے عکس نظر آتے جیسے آسمان زمین پر اتر آیا ہو۔ بادلوں کو زمین کے پانی میں دیکھ کر اس کا دل ہمیشہ اداس ہو جاتا تھا۔ اداسی کے عالم میں اسے گھر میں نکلا اچھا نہیں لگتا تھا اس لئے ہمیشہ باہر نکل جاتی تھی اداسی چھوٹ کی بیماری نہیں ہے۔ یہ ایک ایسے پھول کی طرح ہوتی ہے۔ جو کسی کو نے میں خود ہی کھلتا ہے اور خود ہی مرنے لگتا ہے۔ دوسرے جھکائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

لابی میں تو حیدر بیٹھا تھا اسے نظری نہیں آیا اور تو حید کو دن دیناڑے نظر انداز کیا جائے تو حیدر کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لئے دے پاؤں اس کے پیچھے چلا آیا۔ دلّٰویز سیدھی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آئینہ ایک گونگی تیلی کی طرح ہوتا ہے۔ سب دیکھتا ہے۔ سب محسوس کرتا ہے۔ مگر کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ اس کے پاؤں تلے روئی کا وہی پھوندا آ گیا تب اسے یاد آیا کہ وہ تو اپنے ناخنوں پر سے نیل پاش اتار رہی تھی بڑا دنون تھا اسے ناخنوں پر رنگ برنگی پاش لگنے کا۔ ہر ہفتے باقاعدہ ناخن صاف کئے

”جی ہاں۔۔۔۔۔ میری ایک بچی ہے۔“

قطب صاحب کے لیے جب زمانے بھر کی اداسیاں تھیں۔ ایسی اداسیاں جو تروتازہ لوگوں کے دل چیرے رکھ دیتی ہیں۔

”میں اسی ضمن میں مسز بیگ سے ملے آیا تھا میرے پاس وقت بہت کم ہے۔۔۔۔۔“

اور۔۔۔۔۔“

آپ کی بیگم کہاں ہیں جی؟ ”دلّٰویز نے ان کی بے چینیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پوچھ لیا۔“

”وہ بیمار ہیں۔۔۔۔۔!“

”اچھا کب سے؟ کیا ہوا؟ کیا ہوا ہے نہیں جی۔۔۔۔۔ دلّٰویز نے اپنے اندر کی آوازوں سے بچنے کے لئے ساری باتیں پوچھ لیں۔“

”وہ۔۔۔۔۔ اچھا جی۔“

قطب صاحب ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ”یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے مسز بیگ سے ساری باتیں طے کرنا ہیں۔ میں چھ بجے کے بعد ان سے بات کروں گا اور پھر آ جاؤں گا۔“

”جی بہت اچھا۔“

دلّٰویز بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

قطب صاحب نے جھک کر میز پر سے اپنا پائپ اور تمباکو کی تھیلی اٹھائی۔ پھر دونوں کو جیب میں رکھا۔ وہ جب مزے تو ایک انتہائی نفیس خوشبو کا جھوٹکا دلّٰویز کے نکتوں سے نکل آیا بعض جھوٹے خود بولتے ہیں۔۔۔۔۔ کہتے ہیں ہم سے آ کر نکلاؤ۔۔۔۔۔ بادل بادل سے نکراتے ہیں تو مینہ برستا ہے۔ دل سے نکراتا ہے تو لہو کی آندھیاں چلتی ہیں مگر جھوٹا جھوٹے سے نکراتا ہے تو چاروں طرف اداسیاں پھیل جاتی ہیں۔ خوشبودار اداسیاں جن کے حضور زندگی

جاتے اور کوئی دوسرا شیڈ استعمال کیا جاتا۔ ہاتھ بھی تو اس کے بہت خوبصورت تھے جس طرح پھولوں کو سینچتے ہیں اس طرح وہ اپنے ناخن پال رہی تھی۔۔۔ اب جو ناخنوں پر نظر ڈالی تو وہ عجیب طرح ننگے ننگے کھر دے کھر دے سفید سفید نظر آئے۔ اپنے ہی ہاتھ اجنبی لگ رہے تھے۔

اس نے جھٹک کر دونوں ہاتھ پرے کئے تو وحید اندر آ گیا بولا:
”ایسے لگتا ہے قطب صاحب تمہارے منہ پر تھپڑ مار کر گئے ہیں۔“

دلاؤ نے نظر اٹھا کر تو حید کی طرف دیکھا تو حید ویسا ہی لگا جیسا روز لگتا ہے۔
”تو تمہیں معلوم ہے۔“ دلاؤ نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا اور بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

”کیا۔۔۔ کیا۔۔۔؟“
تو حید آگے بڑھ آیا۔

”جس طرح تمہارا دل بد صورت ہے اسی طرح کی بے ذہنگی بات تم کرتے ہو۔۔۔“
”اچھا۔۔۔ وہ لہرا۔۔۔“ تو کون تھے یہ جناب قطب صاحب۔۔۔ شکل سے تو ذرا بھی قطب نہیں لگ رہے تھے۔

”میں لوگوں کی شکلیں نہیں دیکھتی۔“

”تو کیا تم لوگوں کے دل دیکھتی ہو۔۔۔؟“ وہ اس کے جواب دینے سے پہلے بولا۔
”کیا کرو گی اتنے دل دیکھ کر۔۔۔ بس ایک ہی دل دیکھ لو۔“

”ابھی میں نے کچھ کہا تھا نا؟“ دلاؤ ویز بولی۔

”کیا؟ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔“

”کہہ تمہارا دل بد صورت ہے۔“

”بیرادل تو تم ہو لگی!“
یہ کہہ کر تو حید اتنی زور سے ہنسا جیسے اس نے کوئی بڑی دلچسپ بات کہہ دی ہو۔

☆.....

دلاؤ ویز جب چائے کی ٹرائل لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ڈرائنگ روم میں کوئی دلخراش واقعہ ہو چکا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ مسز بیگ اپنی سفید شال ارد گرد لپیٹنے اپنے صوفے پر گم صم بیٹھی تھیں اور قطب صاحب سامنے والے صوفے پر یوں بیٹھے تھے جیسے ابھی ابھی مراتب میں گئے ہوں ایسی خاموشی چھائی تھی دونوں کے درمیان جیسے ساری باتیں ہو چکی ہوں مگر کچھ ایسی اچھی باتیں نہ ہوئی ہوں بعض اوقات ایسے موسم میں رسات ہوتی ہے۔ جب زمین کی بھڑاس باہر نکل آتی ہے۔ ہوا بند ہو جاتی ہے۔ چاروں طرف اس پچیل جاتی ہے۔ ہر طرف سے گری ٹکنا شروع ہو جاتی ہے۔

”چائے بناؤں؟“

دلاؤ ویز نے دھیرے سے پوچھا۔

مسز بیگ نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔ مگر قطب صاحب فرش پر نظریں جمائے چپ بیٹھے رہے دلاؤ ویز جانتی تھی کہ اس کی ماں بڑی خدا ترس خاتون ہے۔ ذرا سی بات سے اس کا دل پگھل کر اس کی آنکھوں میں آ جاتا ہے۔ مگر وہ ذرا سی بات جانتے کے لئے اس کا دل پچل اٹھا۔

اس نے چائے بنا کر پہلے قطب صاحب کو دی انہوں نے چونک کر پیالی پکڑ لی پھر ادھر ادھر دیکھا۔ دلاؤ ویز نے جلدی سے بڑھ کر چھوٹی سی پیالی ان کے آگے کر دی۔ جس پر انہوں نے چائے کی پیالی رکھ دی۔ پیالی میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ اور بھاپ پر ان کی نظریں جمی تھیں۔ بعد میں دلاؤ ویز نے کھانے پینے کا سامان بھی اس پیالی پر رکھ دیا۔ پھر مسز

بیگ کو چائے بنا کر دی..... اور خود سامنے کونے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں چپ چاپ چائے پیتے رہے جیسے دونوں کے پاس کہنے کو کوئی بات نہ رہی ہو اور دلاؤ ویز چاہتی رہی۔ وہ دونوں کوئی بات کریں ایسی بات جس سے جوہل پن کا یہ حال لاٹ جائے مسز بیگ بہت کم گوئیں اور زود فہم بھی تھیں خود بھی تھوڑی بات کرتیں اور دوسروں کو بھی کم کہنے دیتیں۔
دونوں نے چائے پی لی۔

تو قطب صاحب نے اپنا پانپ جیب سے نکال کر جلا یا اور اس طرح پینے لگے جیسے اپنا جگر پھونک رہے ہوں اس وقت دلاؤ ویز نے انہیں غور سے دیکھا..... انہوں نے براؤن رنگ کا چیک سوٹ پہنا ہوا تھا گہرے براؤن رنگ کی ٹائی باندھی ہوئی تھی جس پر زرد رنگ کی آدمی تر جھکی لکیریں تھیں۔ کوٹ میں سے قمیض کا کارنظر آ رہا تھا پیلے رنگ کی سلاک کی قمیض تھی۔ اس قمیض کے کف بھی کوٹ کی آستینوں سے جھانک رہے تھے۔ گہرے براؤن رنگ کے اندر سے ہلکا پیلا رنگ اس طرح جھانک رہا تھا۔ جیسے تھک جھڑیوں میں کوئی زرد گلاب پھوٹ نکلا ہو جو تھے بھی ان کے گہرے براؤن تھے اور تو اور ان کے چہرے کا رنگ بھی براؤن لگ رہا تھا۔ دلاؤ ویز نے غور کیا بالکل عام سی شکل کے تھے قطب صاحب۔

ان کی صورت ناقص و نگار میں کوئی خاص بات تھی ان کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں مگر اداس تھیں بھنویں بہت موٹی اور تہہ دار تھیں ہاں سر کے بال کافی گھنے تھے۔ کن پٹیاں تو سفید تھیں ہی..... اور سر کے بالوں میں بھی کہیں کہیں گہرے رنگ کی تاریں نظر آ رہی تھیں۔ الگ الگ کر کے دیکھتی تو ان میں کوئی خاص دلکشی نہ تھی، لیکن ان کا مجموعی تاثر عجیب تھا۔ ایسے جیسے ساری دنیا کی خاک چھان کر کوئی تھکا ہارا مسافر ایک درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھ جائے شاید بہت تھک چکے تھے قطب صاحب.....

پانپ پیتے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے بار بار قہقہے میں سے تبا کو نکالتے اپنی انگلیوں

سے پانپ کے اندر بھرتے..... پھر تبا کو کوک چس کی تیلی دکھاتے اور لمبے لمبے کش لیتے..... شعلہ سا جو لچکا تھا وہ بھگ جاتا اور پانپ کے جگر سے دھواں نکلنے لگتا..... سوچتے وقت وہ اس دھوئیں کی چادر اپنی آنکھوں کے آگے تان لیتے اس لئے دلاؤ ویز کو پتہ نہ چلتا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں۔

اگر اچھے ہوئے مردوں کے پاس پانپ جیسا کھلوتا نہ ہو تو وہ اپنے آپ پر پردے کس طرح ڈالیں دلاؤ ویز نے دل میں سوچا..... یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے پانپ کے ساتھ بڑے مصروف ہیں۔ مگر در پردہ..... اپنے کا پتے انھوں کی لرزش..... اور دل میں پڑے جھجک دھاگے چھڑا رہے ہوتے ہیں۔ دلاؤ ویز بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ بڑے محترم لمبے مسز بیگ سے اجازت چاہی مسز بیگ بھی ساتھ ہی کھڑی ہو گئیں۔
وہ بولے:

”میں کب چھوڑ جاؤں اپنی بیٹی کو.....؟“

”پرسوں لے آئیے گا..... آپ کو لندن کب جانا ہے؟“

”جمعرات کو!“

وہ اداسی سے بولے۔

”تو پرسوں ٹھیک رہے گا، ٹھیک رہے گا نا؟“

”جی ہاں.....“ وہ جلدی سے بولے۔ ”کل میں اس کا سارا ضروری سامان اسے لے

دوں گا اور پرسوں صبح نوبے انشاء اللہ آپ کی خدمت حاضر ہو جاؤں گا۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ مسز بیگ نے خوش دلی سے کہا۔

انہوں نے جھک کر سلام کیا۔ خدا حافظ کہا اور باہر نکل گئے۔ دلاؤ ویز بڑے غور سے ان

کے قدموں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس طرح چل رہے تھے جیسے انہیں کسی کی پروا نہیں

وہ آکر ان کے بستر کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

”یہ جو قطب صاحب آج آئے تھے نا؟ بچارے بڑے دکھی ہیں؟“

(ہاں اسی لئے دوسروں کو دکھی کر جاتے ہیں۔)

”ہاں جس دن میں نے انہیں آپ کا فون نمبر دیا تھا، اسی دن معلوم ہو رہا تھا کہ بڑے

ضرورت مند ہیں۔“

”انہوں نے اسی شام مجھے فون کیا تھا تو میں نے انہیں آج کے لئے ٹائم دے دیا تھا

اچھا کیا تھا، میرا خیال ہے ایسے لوگوں کے کام آنا چاہئے۔“

”پتہ ہے۔ ان کی بیوی کو کینسر ہو گیا ہے، وہیں لندن میں ہے۔۔۔۔۔ آج کل اس کی

حالت خطرے میں ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“

دلا ویز کو قطب صاحب کی اداسی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

ان کی ایک بچی ہے! آٹھ سال کی!۔۔۔۔۔ اس کے داخلے کے لئے آئے تھے۔“

”بچارے۔“

دلا ویز بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”میں تو جو کر سکتی تھی، میں نے ان کے لئے کر دیا ہے۔“

”اچھا کیا ہے می۔۔۔۔۔ انسان کو انسان کے کام آنا چاہئے۔“

”ارے وہ تو حیدر نہیں آیا آج۔۔۔۔۔ انہوں نے ایک دم دلا ویز سے پوچھا۔

”آج تو شاید نہیں آیا۔“ دلا ویز کھڑی ہو گئی۔

”اس کی چھٹیاں تو ختم ہونے والی ہوں گی۔ بیٹا اس کی ایک دن دعوت بھی تو کرنا

ہے۔“

قدموں میں استقامت کب آتی ہے بھلا۔۔۔۔۔؟ جب مرد نے ساری دنیا روند لی ہو تبھی تو مڑ کر
پیچھے نہیں دیکھتا۔

دلا ویز شیشے میں سے دیکھتی رہی۔ انہوں نے موٹر کا دروازہ کھولا۔۔۔۔۔ بیٹھے۔۔۔۔۔ دروازہ

بند کیا۔۔۔۔۔ اور اس طرح موٹر شائرت کی جیسے وہ کائنات کو اپنے اشاروں پر چلانا چاہتے

ہوں۔۔۔۔۔ موٹر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے سر جھٹک کر کمرے میں دیکھا سبز بیگ

جا چکی تھیں۔ ٹرائی میں برتن واپس رکھتے ہوئے سائیز نیبل پر پڑا ہوا وزینگ کارڈ اس کی

نظروں میں آ گیا۔ اس نے لپک کر اٹھا لیا۔

اس پر لکھا تھا قطب عالم۔

”قطب عالم۔“

واہ۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔ اس نے تھوڑی دیر تک اس کارڈ کو پکڑے رکھا، الٹ پلٹ کر دیکھا۔

بلکہ سو گھ کر دیکھا، اس کے اوپر خوشبو کا وہی جھونکا بیٹھا تھا، غیر محسوس سا۔۔۔۔۔ مغرور سا۔۔۔۔۔ تانتا

سا۔۔۔۔۔

دلا ویز نے کارڈ کو ضعیف میں دبا دیا اور ٹرائی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی، اسے معلوم تھا، سبز

بیگ ہر بات ایک دم سے نہیں بتاتی تھیں، ان کی عادت تھی کہ وہ پہلے بات کو ہضم کرتیں۔۔۔۔۔

اپنے اندر ڈال لیتیں اور پھر آہستہ آہستہ دلا ویز کو بتا دیتیں۔ اس لئے وہ انتظار کیا کرتی۔

رات کو جب وہ ان کے کمرے میں دودھ کا پیالہ رکھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی تو

انہوں نے سیکے پر سے سر اٹھا کر کہا:

”دل۔۔۔۔۔“

وہ پلٹ آئی۔

”سنو۔“

”رہنے دیں مئی دعوت.....“ دلا ویز پاؤں بیچ کر بولی ”روز تو یہاں سے کھانا کھاتا ہے۔“

”میں آج کل کے رشتہ دار سب ایک سے ہوتے ہیں۔ وہ مجھ دار آدمی ہیں۔ کوئی وجہ ہوگی۔ رشتہ داروں کے پاس چھوڑنا نہیں چاہتے۔“

”تو ٹھیک ہے مہم۔“

”ان کو مکان کی تلاش تھی میں نے کہہ دیا کہ ان کے آنے تک ہم اپنی انیکسی ٹھیک کرا دیں گے۔ وہ وہاں رہ سکتے ہیں۔“

”مہم پچھلے کرایہ دار تو اس کا ستیاناس کر کے گئے ہیں۔“

”نہیں یہ ایسے معلوم نہیں ہوتے۔“

”آپ تو ہر ایک پر بھروسہ کر لیتی ہیں۔“

”کرنا پڑتا ہے بیٹا اس دنیا کے کاروبار بھروسے پر ہی چلتے ہیں بار بار دھوکا کھائیں تو بار بار بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ آپ کی مرضی مہم۔“

”اور سنو ان کی بیٹی تمہارے ساتھ تمہارے کمرے میں رہے گی۔“

وہ تھوڑی دیر چپ رہی تو مسز بیگ بولیں:

”رکھ لو گی نا؟“

وہ زور سے ہنس پڑی۔

”مہم آپ نے ان سے وعدہ کر لیا ہے نا؟“

”ہاں کر لیا ہے۔“

”تو بے فکر رہیے۔ جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گی۔“



تیسرے دن قطب صاحب اپنی بیٹی کو لے کر آگئے اس وقت دلا ویز نمری سکول کی

”نہیں بیٹی۔۔۔ اب اس کی ملازمت لگی ہے پہلی بار نوکری پر جا رہا ہے بچے کا حوصلہ بڑھانا چاہئے۔“

دلا ویز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کہاں تعینات ہوا ہے وہ.....؟“

”مہم وہ تو غالباً پشین جا رہا ہے۔“

”اچھا کل مجھے یاد دلا دینا۔۔۔ سکول کا سارا کام کروادیا اس نے؟“

”ہاں مہم۔۔۔ وہ شاید اس نے کروادیا ہے۔۔۔ فرنیچر پالش کروادیا اور کلاسز کے لئے چارٹ بھی بنا کر دے دیئے ہیں۔“

”اللہ اس کی عمر میں برکت دے بڑا نیک بچہ ہے۔“

دلا ویز اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو مسز بیگ نے عینے پر سر رکھ دیا۔ لیکن جلدی ہی عینے سے سرائٹھا کر اسے پکارا۔

”دل۔۔۔“

”جی مہم۔۔۔“

وہ ہنسنے لگی ہوئی سی مزی۔

”اصل بات تو تم سے کی نہیں۔۔۔ یہ جو قطب صاحب ہیں نا؟ ان کی بیٹی کچھ عرصہ کے لئے ہمارے ساتھ رہے گی ہمارے ہاں ہو شل کا تو بندوبست ہے نہیں اس لئے میں نے کہہ دیا کہ ہم رکھ لیں گے۔“

”ان کے رشتہ دار نہیں ہیں۔“

دینا۔ دلاؤ ویز کا خیال تھا وہ ابھی اس کے نام کی جدت اور رومانیت پر تجربہ کر رہے تھے۔ وہ پوزنگ کر رہے تھے۔ جس طرح کسی نے دینے کی کوڑا ہا کر تیل کم کر دیا ہو۔

”جیسا تم جاؤ پری کا سامان اپنے کمرے میں رکھو اور پھر اسے زمری سکول کی طرف لے جانا سارا سکول دکھانا بچوں سے ملوانا اسے مصروف کرلو۔ تاکہ اپنے باپ کا جانا محسوس نہ کرے۔“

دلاؤ ویز کھڑی ہو گئی اور اس نے پری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پری نے آرام سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔ اور مسز بیگ کی طرف منہ کر کے بولی:

”میں بزدل نہیں ہوں اور ابھی بچی ہوں میں اپنے ابی کو خدا حافظ کہوں گی۔ مجھے معلوم ہے۔ میرے ابی رات کو فلائٹ سے لندن جا رہے ہیں۔ جہاں میری امی بیٹا ہیں۔“

مسز بیگ اور دلاؤ ویز دونوں پتھر اگئیں پری چلتی ہوئی قطب صاحب کے پاس گئی ان کو گلے لگایا ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ جواب میں قطب صاحب نے اس کے پھولے پھولے رخساروں کو چومو اور اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے ہو گئے۔

”او۔ کے پری۔“ انہوں نے ہنس کر پری کی آنکھوں میں جھانکا۔

دلاؤ ویز نے پہلی مرتبہ انہیں ہنسنے دیکھا تھا مگر یہ کیسی ہنس تھی۔ چہرے کا ایک نقش بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلایا تھا۔ جیسے باپلی بوگر پھول پتہ نہ ہلے ہوں۔ دانت تک تو نظر نہیں آئے ان کے۔ دلاؤ ویز کا دل چاہا قطب صاحب اسے سچ بچ منجس کے دکھائیں بھلا وہ ہنسنے کیسے لگتے ہیں۔ شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہنسی بھی حسن کا ایک حصہ ہوتی ہے مگر قطب صاحب نے آگے بڑھ کر پری کا ہاتھ دلاؤ ویز کی طرف بڑھایا۔

”میں جا رہا ہوں اور مجھے امید ہے میری بیٹی اپنی اچھی عادتوں کی وجہ سے آپ میں

کلاس لے رہی تھی مسز بیگ کی چٹلی تو پیرینہ ختم ہونے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ گئی ایک بے حد صوفی سی سرخ و سفید بچی گرم کپڑوں میں اس طرح پھنسی ہوئی تھی۔ جس طرح خرگوش کھل میں مکس جاتا ہے۔

”ادھر آؤ۔۔۔“ اسے دیکھتے ہی دلاؤ ویز کو ٹوک کر یاد آ گیا۔ بلکہ نفی زیادہ آئی۔ وہ ملک ملک کر چلتی ہوئی دلاؤ ویز کے پاس آ گئی اس کے ساتھ ہی خوشبو کا غیر محسوس سا جھونکا بھی آیا۔۔۔۔۔ وہ جھونکا جو پچھلے چار دنوں سے اسے بے سکون کر رہا تھا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“

”پری۔“

”ہائے اللہ اتنی مونی پری۔“

یہ کہتے ہی دلاؤ ویز کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ فوراً قطب صاحب کی طرف دیکھا وہ پانچ منہ سے لگائے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے نہیں دیکھ رہے نہ چہرے پر کوئی تاثر نہ تکلم۔ نہ تبسم۔۔۔۔۔ خالی خولی چہرے غصہ دلاتے ہیں اور پھر کسی مرد کا چہرہ خالی نہیں ہوتا چاہئے۔ خصوصاً کسی جوان اور خوبصورت لڑکی کے سامنے۔ ”کتی پیاری بچی ہے نا۔۔۔۔۔“

مسز بیگ نے جلدی سے بات کو سنبھالا۔

”بیٹی آپ ہمارے ساتھ رہیں گی نا؟“

”ہی ہاں۔“

پری نے سدھائے ہوئے لہجے میں فوراً کہا۔

”دل۔“ مسز بیگ دلاؤ ویز کو ہمیشہ دل کہتی تھیں ان کے اس طرح پکارنے پر دلاؤ ویز سے چہرے پر رنگ کا ایک پھینٹا آیا اور جیسی بار قطب صاحب نے چونک کر دلاؤ ویز کی طرف

”ٹھہل مل جائے گی۔“

”انشاء اللہ۔“

دلّا ویز کی جگہ مسز بیگ نے جواب دیا۔

”ابی آپ خط لکھیں گے نا؟“ پری نے پوچھا۔

”بیٹا! ضروری نہیں کہ میں خط لکھوں تمہیں معلوم ہے خط لکھنے میں چور ہوں البتہ ہر ہفتہ آپ کو فون کیا کروں گا۔“

”اچھا۔۔۔ ابی۔۔۔ ای کو میرا ایک چپا دیتا۔۔۔ وہ ہاتھ چمڑا کر باپ کی طرف لپکی ایک دم قطب صاحب جھکے۔۔۔ پری نے ان کے گلے میں بائیں ڈال کر ان کے رخسار پر اپنے ہونٹ رکھے اور پھر چہرہ اٹھا کر بولی:

”اس طرح۔“

”ٹھیک ہے۔“

وہ پھر اس طرح مسکرائے جیسے آپریشن کے دوران مسکراتے ہیں اس منظر پر دلّا ویز کی آنکھوں میں خواہ مخواہ آنسو آ گئے۔

اس نے آگے بڑھ کر پری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ باہر نکلنے سے پہلے پری نے پھر کہا۔

”خدا حافظ ابی۔“ اور دلّا ویز جلدی سے اسے لے کر باہر نکل آئی۔

رات کو اپنے کمرے میں سامان جاتے ہوئے دلّا ویز نے پری سے کہا۔

”بھئی تمہارا نام پری کیوں ہے؟“

”کیوں کیا برنامہ ہے۔“

”نہیں۔ نام تو بہت اچھا ہے۔ مگر پریاں تو الگ مخلوق ہوتی ہیں۔“

”میں بتاؤں آئی؟“

”نہیں۔“

”نہ بتاؤں۔۔۔؟“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

”نہیں۔ میں یہ کہہ رہی ہوں۔۔۔ مجھے آنٹی بلوانا اچھا نہیں لگتا۔“

”تو پھر میں کیا کہوں آپ کو؟“

”میرا نام بلایا کرو۔“

”اس طرح سب کہیں گے میں بدتمیز بچی ہوں۔“

دلّا ویز کھلکھلائیں پڑی: ”پری تمہیں اتنی باتیں کس نے سکھائی ہیں۔“

”اللہ نے۔“ وہ ایک دم بولی۔

اس پر دلّا ویز نے اسے پکڑ کر چوم لیا۔۔۔ اور بولی۔

”اچھا تم مجھے باجی کہا کرو۔۔۔ اور میری امی کو آنٹی کہا کرو۔“

”اچھا جی۔“

”بلکہ مجھے دل باجی کہا کرو۔“

”باجی آپ کا نام دل کیوں ہے؟ دل کوئی انسانوں کا نام ہوتا ہے۔“

”اچھا اب تم بدل لے رہی ہو۔“

”نہیں باجی آپ ذرا سوچیں نا کبھی آپ بیمار ہوں تو لوگ کہیں گے دل کو بخار

ہے۔۔۔ تو کتنا جیب لگا گئے۔“

دلّا ویز ہنسنے لگی:

”اسی لئے تو میں کبھی بیمار نہیں ہوئی۔“

”اور اگر کبھی آپ گر جائیں تو لوگ کہیں گے دل گر گئی ہے۔“

”میں کبھی نہیں گرتی پری۔“

ہاتھیں کرنا سیکھا تو سب مجھ سے پوچھتے تمہارا نام کیا ہے۔ میں فوراً کہتی پری اس طرح سب نے مجھے پری کہنا شروع کر دیا اور میرا نام ہی پری پڑ گیا۔“

”تمہیں اپنا نام اچھا لگتا ہے؟“

”ہاں اب تو بہت اچھا لگتا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے ہم سارے اسکول سے کہہ دیں گے، تمہیں پری ہی بلایا کریں تم ہو بھی اتنی خوب صورت جیسی پریاں ہوتی ہیں دیکھو تمہاری آنکھوں میں کتنے اچھے اچھے رنگ ہیں لاؤ میں تمہارا نائنٹ سوٹ نکال دوں۔ دلاؤ ویز کھڑی ہوگی۔“

”دل باجی! میں اپنا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہوں! کی کہتی ہیں۔ لڑکیوں کو اپنا کام کرنے کی عادت ہونی چاہئے۔“

پری نے اپنی نائی نکالی اور غسل خانے میں چلی گئی! واپس آ کر اس نے اپنے کپڑے بیگر میں لگائے۔ وارڈ روپ میں لٹکا دیئے۔ دلاؤ ویز حیرت سے اس معصوم سی بچی کو دیکھتی رہی۔ جیسے اس کی ماں نے جینے کے قابل بنانے کی کوشش کی تھی۔

”دیکھو پری! وہ تمہارا بستر ہے! اکیلی سو جاؤ گی نا؟“

دل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ کیوں کہ اسے تو بچے کو ساتھ سلا نا ہی مصیبت لگ رہا تھا۔

”جی میں بالکل اکیلی سوتی ہوں۔“ پری نے اپنی گول منٹول ہاتھ نچا کر کہا۔ ”وہاں لندن میں بچوں کا کمرہ بالکل الگ ہوتا ہے۔ اکی کہتی ہیں۔ بچوں کو الگ سونا چاہئے۔ جو بچے ماں بات کے ساتھ لپٹ کر سوتے ہیں۔ ان کی گردن تھڑک جاتی ہے۔“

اس پر دل قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

”سچ پری۔“

”اچھا۔ اگر۔۔۔ آپ۔۔۔ گھر سے باہر گئی ہوں تو لوگ کہیں گے دل باہر گئی ہے تو کبھی دل بھی باہر جاتا ہے۔“

”اچھا پری تو جیت گئی میں باہر گئی۔۔۔ اصل میں میرا نام دلاؤ ویز ہے۔ تو یہاں سے میری ای مجھے دل کہتی ہیں! بس مجھے اچھا لگتا ہے۔“

”ہاں جی۔۔۔ میرے ساتھ بھی میں معاملہ ہے جب میں چھوٹی سی تھی نا؟“

”ہائے اللہ۔ دلاؤ ویز نے مصنوعی حیرت سے کہا۔۔۔“ تم چھوٹی سی بھی تھیں۔۔۔؟“

”ہاں ہاں۔۔۔ وہ یقین دلانے والے انداز میں بولی۔

”اور اب کیا ہوا۔۔۔؟“

”اب تو بڑی ہوں۔۔۔“

”واہ واہ۔۔۔ یہ تمہیں کس نے بتایا؟“

”میری امی نے۔“

”کیا کہتی ہیں تمہاری امی۔“

”جب میں پاکستان آنے والی تھی تو امی نے کہا تھا پری اب تم بہت بڑی ہو گئی ہو ضد کر کے یارو کر اپنے ابا کو تنگ نہ کرنا۔“

دلاؤ ویز کو یوں لگا جیسے وہ دکھ کے پسینے میں شرابور ہو گئی ہے۔ بالکل چپ کر گئی پری تھوڑی دیر اس کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

”بابائی میری امی نے غلط کہا تھا۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ وہ ایک دم بولی۔ تمہاری امی کبھی غلط نہیں کہہ سکتیں! تم تو واقعی بہت بڑی ہو۔ اچھا بتاؤ۔۔۔ جب تم چھوٹی سی تھیں تو کیا کرتی تھیں۔“

”آپ تو جانتی ہیں میرا نام فریدہ ہے میری امی مجھے فری بلایا کرتی تھیں جب میں نے

”ہاں ہاں مجھے دیکھیں نا؟ اسی لئے میں خوب موٹی تازی ہوں۔“

دل اسے بتانا چاہتی تھی۔ اب بھی کئی بار وہ رات کو می کے کمرے میں چلی جاتی ہے اور ان کے ساتھ لیٹ کر سوئے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ مگر وہ معصوم بچی کے خیالات کی نفی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مصنوعی حیرت سے بولی:

”اچھا تو اسی لئے تم اپنی عمر سے بڑی نظر آتی ہو۔ اتنی عقل کی باتیں کرتی ہو۔“

”ہاں ہاں دل باجی۔ یہی میری امی کہتی ہیں۔“

”یہ سب امی رات کو مجھے بڑے لوگوں کی کہانیاں سنایا کرتی ہیں کبھی ہیں۔ بڑے لوگوں کی باتیں سننے سے بچے جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔“ وہ امی کی سنائی ہوئی کہانیاں کہتی رہی اور دل..... اپنی پٹلیوں پر آنے والے آنسو روکتی رہی۔
”نعمتی سی بد نصیب پری..... تیری ماں کس کس طرح تجھے تنہا جینے کا حوصلہ بخشتی رہی۔ خدا تجھے ایسے غم نہیں کا حوصلہ دے۔“

☆

کھانے کے بعد توحید سید سجاد لاؤ بڑے کمرے میں آ گیا اور آتے ہی پری کو اپنی گود میں بھر لیا۔ پھر اس کی دو لمبی لمبی چوٹیاں کھینچ کر بولا:

”پری اور چڑیل یہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”بائے اللہ انکل آپ دل باجی کو چڑیل کہہ رہے ہیں۔“ پری اپنی دونوں چوٹیاں چھرا کر خفگی سے بولی۔

”میں نے تو دل کا نام ہی نہیں لیا۔“ وہ بھی مصنوعی انداز سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

”پھر آپ نے چڑیل کس کو کہا ہے؟“

”بھئی ہر پری کے ساتھ ایک چڑیل لگی ہوئی ہوتی ہے۔“

”نہیں پری.....“ تاش کے چٹوں کی گلدی ہاتھ میں پکڑ کر دلاؤ بڑ بولی:

”ہر پری کے پیچھے ایک بیسٹا نک جن لگا ہوتا ہے چڑیل نہیں۔“

توحید نے خوب زور کا قبضہ لگایا۔ ”یہ ہوئی نا بات..... دل والوں کی.....“ پھر وہ

دلاؤ بڑ کی طرف آ گیا اور بولا:

”ہو جائے بازی۔“

”یہ بازی لگانے کی عادت تمہاری جاتی نہیں۔“

”تم تو جانتی ہو وہ ایک آنکھ بند کر کے بولا۔ لگا تار ہوں گا بازی..... حتیٰ کہ جان کی

بازی لگا دوں گا۔“

”ارے جاؤ دیکھ ہوئے ہیں..... میں نے ونا سیتی عاشق..... آج کل کے نوجوانوں

میں جان ہی نہیں تو جان کی بازی کہاں سے لگائیں گے۔“

”ہائے ہائے یہ ماؤرن لڑکیاں.....“ توحید نے اس کی نقل اتاری جب بھی دیکھو عشق

و عاشقی میں گڈے گڈے ڈوبی نظر آتی ہیں کیا صرف جان کی بازی لڑکیوں کے لئے لگانی

چاہئے۔ میں فوجی ہوں فوجی.....“ وہ سینہ پھیلا کر بولا۔ جانتی ہو مجاہد ہمیشہ اپنے وطن اور اپنی

زمین کے لئے جان کی بازی لگا تا ہے۔ میری جان اتنی سستی نہیں کہ تم جیسی تک چڑھی لڑکی

کے لئے۔ دلاؤ بڑ لگا دی جائے۔“

”اٹو۔“ توحید.....

دلاؤ بڑ چڑ گئی۔

”خواہ تو اذاتیات کو بیچ میں نہ لایا کرو اور نہ کسی خوش فہمی میں رہا کرو مذاق تو مذاق ہوتا ہے“

”اور میں کب مذاق کر رہا ہوں جان ہی دے رہا ہوں نا؟ تم لے لو۔ تمہیں منظور نہیں تو

وطن کو دے دوں گا۔“

”بکواس مت کرو تو وحید.....“ فوراً ہی دلا ویز نے نوک دیا اور بولی:

”ہمیں تھوڑا کھیلنے دو۔“

”میں بھی کھیلوں گا۔“

”تم روئند‘ مارتے ہو.....“

”دل باجی‘ روند کیا ہوتا ہے؟“ پری نے پوچھا۔

”یہ کھیل میں ہمیشہ بے ایمانی کرتا ہے۔“ دل بولی۔

”قسم سے بے ایمانی نہیں کروں گا۔ تم جانتی ہو بے ایمانی کرنے والا کبھی بازی نہیں

جیت سکتا۔“

”اس لئے تو میں کبھی ہوں تم ہار جاؤں گے۔“

”چلو۔ آج ہی دیکھ لیتے ہیں۔“

”آؤ بھئی۔“

تینوں کھیلنے بیٹھے..... تو وحید نے بڑی دیانت داری سے کھیلا اور پہلی بازی ہی ہار گیا۔

اس پر دلا ویز اور پری نے اسے خوب خوب شرمندہ کیا‘ تو جھل مندی سے بولا۔

”بھئی مجھے تاش کھیلنے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں یونہی آپ لوگوں کی خاطر کھیل لیتا

ہوں۔“

”آپ کو کس کھیل میں دلچسپی ہے۔“ پھر پری نے درمیان میں پوچھا۔

”بھئی ہے ایک کھیل جس میں مجھے دلچسپی ہے‘ مگر کوئی دوسرا کھیلے بھی میرے

ساتھ.....“ میزھی آنکھ سے اس نے دلا ویز کی طرف دیکھ کر کہا۔ دلا ویز نے سارے پتے

اکٹھنے کر کے دراز میں رکھ دیئے اور بولی:

”تو وحید صاحب آپ تشریف لے جائیے‘ ہم آرام کریں گے۔“

”وطن ہی کو دے دو میں نے کیا کرنی ہے یہ بے اعتبار جان۔“

”دیکھو..... سوچ لو..... جب کبھی ایسا وقت آیا اور میں محاذ پر چلا گیا۔ تو مزاروں پر

دعا میں مانگتی پھر وگی اور مسجدوں میں دینے جلاتی پھر وگی۔“

پری ان دونوں کی باتیں سمجھے بغیر کبھی ایک کو دیکھتی اور کبھی دوسرے کو

”تو وحید.....“

”دلا ویز نے ایک دم بڑی سنجیدہ شکل بنائی جیسے کسی اہم معاملے پر گفتگو کرنے والی ہو

اور بڑی شرافت اور آہستگی سے بولی۔

”تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایک خوب رو جوان بنایا ہے۔ اسے کاش تم میں ذرا سی عقل ہوتی‘ تو

تم کتنے اچھے لگتے سچ ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی بڑا منصف ہے۔ ساری چیزیں ایک ہی ہندے کو

دے دے تو بندہ پتہ نہیں کیا کر بیٹھے.....“

یہ سن کر پری زور زور سے تالیاں بجا کر بننے لگی۔

”یہ بھی سچ ہے۔“ تو وحید نے اس سے بھی زیادہ سنجیدہ شکل بنالی۔“ سوچنا پڑے گا۔ تم تو

مجھ سے بھی زیادہ حسین ہو‘ میں تمہاری طرف دیکھوں تو دل پر قابو نہیں رہتا۔ پتہ نہیں اور

لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ تم میں اللہ تعالیٰ نے کون سی کمی رکھی ہے اور آیا

اس کمی کے ساتھ تمہیں کوئی قبول کرے گا یا نہیں.....“

دلا ویز چپ چاپ پتے پتہ نہ منی رہی..... تو وہ بولا۔

”ہاں اگر یہ بات تم میرے علاوہ کسی کو نہ بتاؤ تو..... تو شاید..... ایک جیالا جو جوان ایسا

نکل آئے جو تمہاری تمام تر بے وقوفیوں سمیت تمہیں قبول کر لے۔“

”کون ہے دو تو حیدرا نکل.....“ پری نے ایک دم جھل کر پوچھا:

”تمہارے ابا کا فون آتا ہے پری؟“ وہ بولا۔

”ہاں اگل۔“

پری ایک دم پلنگ پر کھڑی ہو گئی، ایک عجیب سی خوشی اس کے چہرے سے بھوٹی۔
بڑی بڑی آنکھیں کھول کر۔۔۔ اس نے اپنے بازو تو حید کی گردن میں ڈال دیئے اور بولی:

”ہر پٹنے کی شام کو ابی مجھے فون کرتے ہیں۔ ایک بار ہسپتال میں امی سے بھی بات
کر دلی تھی۔“

”کیسی ہیں تمہاری امی اب؟“

پوچھنے کو تو حید نے پوچھ لیا۔ جب پری نے اس کی گردن سے بازو چھڑا لے اور اس
کا دمکا رنگ ایک دم اڑ گیا، تو حید نے ڈر کر دلا ویز کی طرف دیکھا۔ دلا ویز نے سر جھکا
لیا۔

”امی۔۔۔“ پری ہونٹ کاٹ کر بولی: ”امی تو ابھی اچھی نہیں ہوئیں۔۔۔ بڑی کمزور
آواز میں بول رہی تھیں۔“

”تو حید اگل۔۔۔“ وہ بھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیا کینسر سے لوگ بچ جاتے
ہیں۔۔۔“

”اللہ کی قدرت سے بچ سکتے ہیں۔“ تو حید نے بے یقینی سے کہا۔

”نہیں۔۔۔ میری امی نے بتایا تھا۔۔۔ اللہ کی قدرت سے کچھ عرصہ جی سکتے ہیں مگر بچ
نہیں سکتے۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔“ تو حید کی کچھ میں نہیں آیا کر کیا کہے۔

”امی کہتی تھیں، تکلیف میں جینا مجھے پسند نہیں ہے۔۔۔ کیا میری امی کو بہت تکلیف
ہے تو حید اگل۔“

”اگر میں نہ جاؤں تو۔۔۔؟“

”بہتر ہے تم چلے ہی جاؤ۔“ دلا ویز بولی۔ ”تمہارے اعزاز میں آج ڈنر دے دیا گیا
ہے کافی عزت افزائی ہو گئی ہے تمہاری۔ اب ہمارے اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش نہ
کرو۔“

”اچھا یہ تو بتاؤ بلوچستان کب جا رہے ہو۔“

”پرسوں جا رہا ہوں دعائیں دے کر بھیج دو پہلی مرتبہ جا رہا ہوں۔“

”آؤ پری تو حید کے لئے دعا کریں۔“

دلا ویز نے پری کی طرف دیکھا۔

”دل باجی کیا دعا کریں۔“

”کہ یہ یہاں سے دفعان ہو جائے۔“

”نہیں پری۔۔۔ تم دعا کرو دل باجی کا ظالم دل ایک نیک انسان پر آ جائے۔“

”میں زور زور سے ہنسنے لگی۔“

تو حید کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

”دل مجھے خط تو لکھو گی نا؟“

”تم جانتے ہو مجھے خط لکھنے سے دلچسپی نہیں ہے۔ نہ مجھے خط لکھنے ہی آتے ہیں۔“

اور میں تو خط لکھ سکتا ہوں۔۔۔“

”تم تو ہمیشہ لکھتے رہتے ہو۔“

”پری تم مجھے خط کا جواب دو گی۔“ حیرت سے دیکھتی ہوئی پری کے رخسار چھو کر اس

نے کہا۔

”لو میں تو اپنے ابا کو خط نہیں لکھتی۔“

”امی نے مجھے یہی دعا سکھائی تھی۔ وہ کہتی تھیں۔ اللہ میاں بچوں کی دعائیں ضرور سنتا

ہوں۔“

”دلا ویز۔“ اس طرح قطب صاحب کی بھی بھی آواز آئی۔

”جی میں بول رہی ہوں۔“ اس پر گھبراہٹ ویسی ہی طاری تھی۔

”دلا ویز۔“ انہوں نے پھر پکارا۔

”جی میں دل۔“ قطب صاحب۔ میں دل۔“ اور پھر اس کی زبان اپنے دانتوں

تسلے آگئی۔ اپنے اوپر سکون طاری کر کے بولی: قطب صاحب۔ جی ہاں میں دلا ویز بول رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے وقفہ دیا۔ کیونکہ وہ اتنی جلدی بول رہی تھی کہ دونوں آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر لٹ جاتی تھیں۔

دلا ویز مسز بیگ کہاں ہیں؟“ قطب صاحب نے پوچھا۔

”وہ ڈراما رکیٹ تک گئی ہیں۔ ابھی آجائیں گی۔“

”اور پری کہاں ہے؟“

”جی پری بھی ان کے ساتھ گئی ہے۔ جی دراصل پری کو کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ تو می

اس کو ساتھ ہی لے گئی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ لوگ آجائیں گے۔“

قطب صاحب نے ایک لمبی سانس لی۔

”جی مجھے پیغام دے دیں جو بھی دینا ہو۔“ پھر جلدی سے بولی: ”جی پری کی ای کا

کیا حال ہے؟“

”دلا ویز۔“

اس مرتبہ قطب صاحب کی آواز آنسوؤں میں بیگی ہوئی تھی۔ ”میں نے اسی لئے فون

کیا ہے کہ پری کی ای چلی گئیں۔“

”چلی گئیں۔ کب؟ کیسے؟“ مگر اسے اپنے ہی سوال لالینی لگے۔ ان کو تو جانا ہی

تھا پھر کب اور کیسے کیوں۔

”تین دن ہوئے۔“ وہ جیسے قبر میں سے بولے۔ ”آج فون کرنے کا حوصلہ

ہے۔ آپ مسز بیگ سے کہہ دیں وہ کی طرح یہ بات پری کو بتادیں۔ مجھ میں پری سے بات

کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں کل پھر کبھی وقت فون کروں گا۔“

اور انہوں نے فون بند کر دیا۔

فون بند ہو گیا، مگر ریسور دلا ویز کے ہاتھ میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے قدم زمین کے

ساتھ جم گئے۔ پھر اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اس عورت کے لئے جسے اس

نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو اس کی کچھ نہیں لگتی تھی، جس سے اس کا کوئی ناظم نہیں تھا اور جو پری

کی ماں تھی۔ اور معصوم پری کچھ بھی نہ جانتی تھی۔

اچھی طرح رو پکھنے کے بعد دلا ویز نے غسل خانے میں جا کر منہ دھویا۔ اپنے بال

سنوارے اور اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ صاف روئی ہوئی لگ رہی تھی۔ نہ صرف یہ کہ

روئی ہوئی لگ رہی تھی۔ ابھی اور بھی رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور یونہی ادھر ادھر گھومتی رہی۔

قطب صاحب کو لاہور سے گئے تین ماہ ہوئے تھے۔ وہ ہر ہفتے باقاعدگی کے ساتھ پری

کو فون کر دیتے تھے اور پری کو باقاعدہ ان کی طرف سے تحائف اور پیسے مل رہے تھے۔

آج پری اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں خریدنا چاہتی تھی۔ آج پری بہت خوش تھی دلا ویز کو اپنے

کچھ ذاتی کام کرنا تھے۔ اس لئے مسز بیگ اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ جس وقت مسز

بیگ کے ساتھ ہنسی کلکھلاتی ہوئی پری گھر میں داخل ہوئی تو دلا ویز بدروح بنی لان میں ٹبل

رہی تھی۔ اندھیرے میں رک کر اس نے دیکھا۔ پری نے بیٹا پر چیزیں گود میں بھری ہوئی

”اگر ننھے بچے روئیں اور خدا کریں تو جنت میں ان کی ماؤں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر خوش رہیں تو مائیں روز انہیں ملنے آتی ہیں۔“

تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ پھر گویا ہوئیں:

”آپ کی امی تو بہت پیاہتیں نا؟ انہیں بہت تکلیف تھی بہت درد ہوتا تھا انہیں۔“

اب انہیں درد نہیں ہوگا۔ وہاں آرام سے رہیں گی۔“

پری مٹی رہی۔

”آپ کے امی نے کہا تھا وہ کل پھر فون کریں گے، کل جب آپ فون پر بات کریں تو اپنے امی کو خوب حوصلہ دیں۔“

پری یوں سمٹ کے ان کے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی جیسے مرغی کا چوڑہ جیل کو دیکھ کر ماں کے پردوں میں گھس جاتا ہے۔ سبز بیگ تھوڑی دیر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں اسے سہلاتی رہیں۔ پھر اس کا چہرہ اٹھا کر دیکھا اور پیار سے پوچھا۔

”چانکیا بات ہے، انجیک تو ہیں آپ؟“

”جی آئی۔“

پری نے رک رک کر کہا:

”اب میں جاؤں۔“

”دل۔“ سبز بیگ نے آواز دی۔ ”آؤ پری کو لے جاؤ۔“ اتنی دیر میں رو رو کر

دلاؤ ویز نے برا حال کر لیا تھا۔ منہ صاف کر کے آئی پھر پری کو لے گئی۔ پری نے اس کا رویا ہوا چہرہ دیکھا تو آہستہ سے کہا۔

”دل باجی! آپ کیوں روتی ہیں؟ دیکھیں میں نہیں رو رہی۔ امی نے کہا تھا۔ پری اگر تم نے ایک بھی آنسو بہایا تو مجھے بہت تکلیف ہوگی اب میں اپنی امی کو اور تکلیف نہیں دوں

گی۔“

دلاؤ ویز نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے اور کچھ نہیں کہا۔

پری نے آہستہ آہستہ اپنی سب چیزیں سمیٹ لیں۔ معمول کے مطابق جا کر مات کے کپڑے بدلے، گودہ پر کام اپنے ہاتھ سے کر رہی تھی، مگر ایسے لگ رہا تھا اس کے اندر سے زندگی نکل گئی ہے۔ وہ ایک کھلے پتلی ہے بات کرتے وقت وہ نظر بھی نہیں اٹھا رہی تھی۔

دلاؤ ویز اسے بڑی محبت سے دیکھتی رہی اور اس ننھی روح کے حوصلے پر دل ہی دل میں داد دیتی رہی۔ اور جب وہ اپنے بستر پر بیٹھی تو۔۔۔۔۔ دلاؤ ویز بولی:

”پری! آج تم میرے پاس سو جاؤ۔“

”کیوں دل باجی؟“

اس نے اداسی سے پوچھا۔

”بس ایسے ہی آج میری طبیعت اچھی نہیں۔“

”اچھا جی۔“ کہہ کر پری نے اپنا تکیہ اٹھایا اور دلاؤ ویز کے بستر پر آ گئی۔ دلاؤ ویز نے

رشتائی نمٹیک کر کے لگائی، اس کا تکیہ رکھا، کمرے کا نیلا بلب جلا کے بتی بجھا دی۔۔۔۔۔ اور آ کر

اس کے پاس لیٹ گئی۔ پری کے بالوں میں سے بڑی پیاری اور اداس کر دینے والی خوشبو

آ رہی تھی۔ دلاؤ ویز کا دل چاہا اس کے سر پر جا کر رہے۔ مگر اس نے پیار نہیں کیا۔ آرام سے

انہیں بند کر کے لیٹ گئی۔ پری نے دو دفعہ مڑ کر دلاؤ ویز کی طرف دیکھا۔ دلاؤ ویز سوئی

نہی۔

اور پھر دلاؤ ویز نے سنا پری رو رہی تھی پری بے اختیار رو رہی تھی۔ پری ننھی ننھی

مایاں بھر رہی تھی۔ پری کی ہر سانس امی۔۔۔۔۔ امی۔ کہہ رہی تھی۔

دلاؤ ویز نے اس وقت اسے چھینرنا مناسب نہیں سمجھا بڑے وقار سے پری نے اپنا بھرم

”پری یوں لگتا ہے سب بچے اپنی امیوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔“
مگر پری نے کسی بچے اور کسی ماں کی طرف توجہ نہیں دی۔ یوں لگ رہا تھا وہ دنیا بھر کے بچوں اور ماؤں سے بے نیاز ہو چکی تھی یا خفا ہو چکی تھی نہ وہ ہنس رہی تھی..... نہ رو رہی تھی نہ کچھ کھا رہی تھی۔ نہ اپنی عادت کے مطابق آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ بس دلاؤ ویزا اس کا ہاتھ بکڑ کے جدھر گھمادی۔ وہ گھوم جاتی۔
”آؤ پری بندروں کو پنے ڈالیں۔“

یہ بھی پری کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا دلاؤ ویزا نے آگے بڑھ کے پنے کے دولفانے خریدے ایک پری کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور دوسرا خود پکڑ لیا۔ وہ دونوں بندروں کے پنجرے کے آگے پہنچ گئیں۔ وہاں اور بھی بے شمار لوگ تھے سب ہی بندروں کو پنے اور مونگ پھلیاں ڈال کے ان کا تماشا کشادہ کر رہے تھے ان کے ساتھ مہخڑیاں کر رہے تھے۔ دلاؤ ویزا نے سارے پنے بندروں کو کھلا دیئے مگر پری کے ہاتھ میں ابھی تک لفافہ ویسے ہی تھا۔
”آؤ پری اگلے پنجرے میں چل کے تمہارے پنے ڈالیں۔“
دلاؤ ویزا اسے اگلے پنجرے پر لے گئی۔

بندر پنچے مارتا ہوا سلاخوں کے ساتھ لگ کے بیٹھ گیا، مگر بندر یا جس نے اپنے سینے کے ساتھ اپنا چھوٹا سا بچہ چھنایا ہوا تھا۔ ایک دم سے پھدک کر لمبی سی شاخ پر جا کر بیٹھ گئی اس نے جنوں کی بھی پروا نہیں کی۔ پری اس کی طرف حیران ہو کر دیکھ رہی تھی۔
تو ایک دم دلاؤ ویزا بولی:

اس بندر یا کو کھد رہی ہو پری۔ دیکھو اس نے اس طرح اپنا بچہ اپنے سینے سے لگایا ہوا ہے اور اسے لے کر اوپر والی شاخ پر چلی گئی ہے تاکہ کوئی اس سے بچر جیسے نہیں۔“
بس اتنا کہنے کی دیر ہی پری نے ایک دم چنچ ماری اور دلاؤ ویزا سے لپٹ گئی۔

بنائے رکھا تھا کیونکہ وہ کبھی تھی۔ وہ بہادر بچی ہے۔ اور دلاؤ ویزا نے اس کے بھرم کو توڑنے کی کوشش نہیں کی حتیٰ کہ نیند میں بھی پری روئی رہی اور سکیاں بھرتی رہی۔
صبح سسز بیک نے دلاؤ ویزا سے کہا:

”آج پری کو لے کر باہر چلی جاؤ اس کے ساتھ اس کی ماں کی باتیں کر کے اسے خوب رلاؤ تاکہ جب شام کو اس کے باپ کا فون آئے تو وہ حوصلے سے بات کر سکے۔“
صبح دس بجے دلاؤ ویزا پری کو گرم کپڑے پہنا کر اپنے ساتھ لے گئی اور بولی:

”آج خوب گھومیں پھریں گے آپ کو ہوٹل میں کھانا کھلائیں گے پری چپ رہی پری نے ہمیشہ کی طرح کوئی فرمائش نہیں کی جہاں جہاں دلاؤ ویزا اسے لے گئی وہ اس کے ساتھ چپ چاپ گھومتی رہی۔ دلاؤ ویزا اسے باتوں میں لگا لیتی اور خواہ مخواہ اس کی ماں کا ذکر چھیڑ دیتی۔ مگر وہ یوں گم ہوم ہو جاتی۔ جیسے وہ پتھر کی ہو گئی ہو۔

بالا خرد دلاؤ ویزا نے پوچھا:
”پری چڑیا گھر چلو گی؟“
”چڑیا گھر پری کی دل پسند جگہ تھی ہر جگہ کو وہ چڑیا گھر دیکھنے کی فرمائش کرتی تھی، مگر اس نے آج کوئی خاص ذوق و شوق ظاہر نہیں کیا۔ بس اتنا کہا۔
”پتہ نہیں۔“

مگر دلاؤ ویزا اسے وہاں لے گئی۔ ہر پنجرے کے آگے کھڑی ہوئی ہر جانور پر تبصرہ کیا، لوگوں پر تبصرہ کیا۔ اور بار بار اس کی توجہ بچوں والی ماؤں کی طرف دلائی۔ ”وہ دیکھو پری..... کتنے پیارے بچے ہیں۔ شاید اپنی امی کے ساتھ آئے ہیں۔“ پری آرام سے منہ پھیر لیتی۔
”وہ دیکھو پری۔ وہ لڑکی بالکل تمہاری طرح ہے اس کی امی اسے کتنا پیار کر رہی ہیں۔“ مگر پری اور دیکھتی ہی نہیں تھی۔

”دل باجی.....“

”دل باجی.....“

”ہیں۔“

پری چپ رہی۔

”میں چند دنوں تک آؤں گا بیٹی۔“

”چند دنوں تک آؤں یا فوراً آ جاؤں۔“

”نہیں ابی جی..... پری بڑے حوصلے سے بولی۔“ جب آپ کو ٹھیک لگے آ جائیں۔“

”آپ ادا تو نہیں ہیں بیٹا۔“

”نہیں ابی جی۔“

”میرا بیٹا ہمارے ہا۔“

”جی ابی جی۔“

”اچھا بیٹا میں اپنے آنے کی اطلاع دوں گا۔“

”خدا حافظ!“

”خدا حافظ! ابی جی.....“ پری نے آہستہ سے کہا اور ریسور رکھ دیا۔ اتنی دیر میں مسز

بیگ اور دلآویز کے دل دھڑکتے رہے بچی بے قابو ہو جاتی تو قطب صاحب کتنے پریشان ہو اٹھتے.....

ایک ہفتے بعد قطب صاحب آگئے وہ یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے پری کو اپنے

ساتھ لے گئے کچھ دن وہ ان کے پاس رہی پھر قطب صاحب اسے واپس لے آئے۔

انہوں نے مسز بیگ کو بتایا ان کا واپس جانا اشد ضروری ہے۔ اب وہ وہاں سے کاروبار ختم

کر کے مستقلاً پاکستان آنا چاہتے ہیں۔ گھریا بیچ دینا چاہتے ہیں پری کو پاکستان میں رکھ کر

بڑھانا چاہتے ہیں۔ اور انہوں نے مسز بیگ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی انکی ٹھیک کرا دیں

وہ اسی میں رہیں گے آکر..... اس طرح پری کو سکول آنے جانے کی آسانی رہے گی پھر وہ

وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے عرصہ سے بوجھ اٹھائے پھرتی تھی اور اب تھک گئی ہو۔ وہاں موجود لوگوں نے تو یہی سمجھا کہ بچی ڈر گئی ہے۔ مگر دلآویز جانتی تھی اسے کیا ہوا ہے۔ دلآویز اسے سمیٹ کر دور لے گئی لان میں ایک طرف بیچ پڑے ہوئے تھے ان پر دلآویز بیٹھ گئی اور پری کا سر گود میں رکھ لیا۔ پری کے آنسو جھرنوں کی طرح بہنے لگے۔ اور رونے کے دوران وہ باقاعدہ ہائے امی..... ہائے امی..... بھی کہہ رہی تھی۔ رونا دلآویز کو بھی آ رہا تھا اس لئے وہ اپنے آنسو چپکے چپکے پونچھتی جاری تھی بہت دیر تک پری روتی رہی حتیٰ کہ دلآویز کی گود گیلی ہو گئی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی ہچکیاں بھی ختم گئیں۔ جب وہ قدرے پرسکون ہو گئی تو دلآویز نے رومال سے اس کا چہرہ صاف کیا اور اس کی ماں کے بارے میں اس سے باتیں کرنے لگی اب پری ہر بات کا جواب دے رہی تھی کبھی ہنس پڑتی کبھی رو پڑتی، لیکن دلآویز نے اسے خوب رونے اور باتیں کرنے کا موقع دیا۔ اس کے بعد اسے کچھ کھلایا۔ اور گھر لے گئی۔

شام کو قطب صاحب کافون آیا تو پری بالکل نارمل تھی۔

”میرا بیٹا ٹھیک ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ابی جی..... پری بولی۔“

”آپ کا دل پریشان تو نہیں۔“

”نہیں ابی جی۔“

”شاباش۔“

”آپ کی امی آپ سے بہت خوش تھیں پری انہوں نے آپ کو بہت سے پیار بھجوائے

بلوچستان خواہوں جیسا خوب صورت علاقہ ہے میری پوسٹنگ پشین میں ہوئی ہے جو کونڈے سے تقریباً ستر میل دور ہے یہ علاقہ ہے جہاں فیشن اہل خواتین اکثر شاپنگ کے لئے آتی ہیں..... گوتم فیشن اہل نہیں ہو مگر خاتون تو ہونا؟ یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا۔ مجھے ہمیشہ سفر میں رہنا بہت پسند ہے۔ میرے سفر کی ابتداء ہوگی ہے۔ جب بیازوں پر بادلوں کے کارواں آ کر ٹھہرتے ہیں۔ اور ہنر وادیاں لگنٹاے لگتی ہیں۔ اور موسم مسکرانے لگتا ہے تو تم مجھے یاد آ جاتی ہو۔ بھئی تم اور چچی جان کچھ دنوں کے لئے کونڈے کیوں نہیں آ جاتے؟ میں تمہارے لئے مناسب گھر کا بندوبست کر دوں گا۔ ابلی بھئی اس مہینے آنا چاہتے ہیں۔ ان سے مشورہ کر کے مجھے لکھو۔ مگر تم کیا لکھو گی..... میں خود فون کروں گا۔

پری امید ہے اب سنبھل گئی ہوگی اسے میرا پیار نہ دینا..... میں ایسے تحائف ہرگز تمہارے توسط سے نہیں بھجواؤں گا۔ بڑا احساندہوں۔

توحید

توحید کی ہر بات اسے ہمیشہ بے ہودہ لگتی تھی۔ کسی زمانے میں اس نے توحید سے واقعی کہا تھا کہ اسے ہمیشہ سفر میں رہنا پسند ہے اور چاہتی ہے کہ اس کا شوہر ایسی ملازمت میں ہو۔ جہاں ہر دو چار سال کے بعد ٹرانسفر ہو جاتی ہو۔ اس سے پہلے وہ اور بھی بہت کچھ کہا کرتی تھی اور تو حیدر ایسا جذبہ جاتی لڑا تھا۔ سب کچھ چلنے سے بندھتا رہا۔

توحید اس کا تائید کرتا تھا.....

فاروق بیگ اور رؤف بیگ دو ہی بھائی تھے اور دونوں میں مثالی پیار تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ مبین جوانی میں فاروق کا سایہ دللا ویز کے سر سے اٹھ گیا اور کچھ عرصہ پہلے تو حید کی ماں اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ مسز بیگ نے دونوں بچوں کو ماں بن کر پالا تھا۔ اس لئے توحید زیادہ تر ان کے گھر رہتا تھا۔ رؤف بیگ بڑے درویش منش انسان تھے ریٹائرمنٹ کے بعد

ان سب لوگوں سے مانوس ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ اسے کہیں اور نہ رکھنا چاہتے تھے۔

قطب صاحب چلے گئے اور اسی طرح ہر ہفتے پری کو فون کر دیتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں سے کچھ دن پہلے قطب صاحب نے مسز بیگ سے فون پر بات کی اور انہیں بتایا کہ وہ ان گرمیوں میں ورلڈ ٹور پر جا رہے ہیں اور پری کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں اگر چھٹیاں ہوتے ہی وہ لوگ مناسب تیاری کے ساتھ پری کو لندن بھجوا دیں تو ان کا پاکستان کا پیکر بیچ جائے گا۔ جن کے پہلے ہفتے مسز بیگ اور دللا ویز نے مناسب تیاری کے ساتھ پری کو جہاز پر سوار کر دیا۔

رخصت کرتے وقت دللا ویز نے اس کے رخسار پر پیار کیا۔ اور کہا:

”پری مجھے خط لکھو گی؟“

”ہاں ہاں دل باجی..... میں آپ کو بہت یاد کروں گی اور آپ کے لئے دھیر سارے تحفے لاؤں گی۔“

.....☆.....

پری لندن چلی گئی، سکول میں چھٹیاں ہو گئیں تو دللا ویز کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے؟ پری کے ساتھ رہنے کی عادت آتی ہو گئی تھی کہ بات بات میں پری یاد آتی یوں بھی دللا ویز کا کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا۔ کسی کے ساتھ مل کر نہ رہتی تھی اب پری کی رفاقت ملی تو اسے سب بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

انہی دنوں توحید کا خط آ گیا۔ توحید جب سے بلوچستان گیا تھا ہر مہینے اسے ایک خط لکھ دیتا تھا۔ توحید کے خط بھی ویسے ہی بے ڈھنگے اور بے ہودہ ہوتے جیسی وہ باتیں کرتا تھا۔

توحید نے لکھا تھا:

”دل!“

منزبگ نے سر اٹھا کے پوچھا۔

مسز بیگ نے اپنے گھر میں ایک جدید طرز کی اینٹنی بنوائی تھی ان کا خیال تھا شادی کے بعد دلاؤ اور تو حید کو اس اینٹنی میں رکھیں گی اور دونوں مل کر سکول کا خیال بھی رکھیں گے۔

تو حید تو جب بھی چچوں میں آتا سکول کے بے شمار کام کر کے جاتا انتظامیہ پر نظر رکھتا۔ ویسے اسکول بورڈ کا وہ بھی ایک ممبر تھا۔ چھوٹا سا خاندان تھا۔ اس لئے چھوٹی چھوٹی بے شمار تنکائیں تھیں جو ایک دوسرے سے وابستہ تھیں۔

ایک صاف ستھرا ملازم سامنے آ گیا۔

”سلام صاحب۔“

اس نے جھٹ کہا۔

”بھئی پری کہاں ہے؟“

”جی وہ ابھی تو اپنے کمرے میں گئی تھیں۔“

اب وہ اندازہ کرنے لگی، کونسا بیڈروم پری کا ہوگا۔۔۔؟ اور سامنے والے بیڈروم میں چلی گئی وہاں ہر شے سفید تھی، قالین سے لے کر بیڈ کوئیک ڈیواروں پر کوئی پینٹنگ نہ تھی، کوئی گلدان نہ تھا، کوئی ڈیکوریشن نہیں نہ تھا۔ بس صرف ایک الٹش ٹرے میز پر پڑا تھا۔ جس کے شیشوں میں سے کئی رنگ کی شعاں عین نکل رہی تھیں۔ اتنا سادہ کمرہ۔ اتنا چپ چاپ کمرہ۔ اتنا گم سم کمرہ۔ دلاؤ وز کے دل کو کچھ ہونے لگا۔۔۔۔۔

اسی وقت پری بغلی کمرے میں سے نکل آئی۔ اور:

”ہائے دل باجی۔“ کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔

”بے وفا۔ تو نے جا کر ایک خط بھی نہیں لکھا۔“

”نہیں دل باجی۔ میں آپ کو کارڈ تو بھیجتی رہی ہوں۔“

”کارڈ کوئی خط ہوتا ہے؟“

”میں نے تو کہا تھا مجھے خط لکھنا نہیں آتا اور ابی لکھ کے نہیں دیتے تھے۔“

”پری تو پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہے۔ کتنی اچھی لگ رہی ہے۔“

”آئیں آپ کو اپنا کمرہ دکھاؤں۔“

”اور یہ کس کا کمرہ ہے؟“ (حالا کہ وہ جان گئی تھی کہ یہ کس کا کمرہ ہوگا۔)

”یہ تو ابی کا کمرہ ہے۔ آپ میرے کمرے میں آئیں۔“

”بھئی وہ۔۔۔ دلاؤ وز نے انکیسی کی طرف اشارہ کیا۔“ وہ پری لوگ۔۔۔

”ہاں۔۔۔“ مسز بیگ اطمینان سے بولیں۔ ”انہیں آئے تو ایک مہینہ ہو گیا ہے۔“

قطب صاحب نے سارا گھر ٹھیک سے سیٹ کر دیا ہے۔ اپنا سامان لے آئے ہیں۔ مگر آج وہ انگلیڈ گئے ہیں پری یہیں ہے۔“

”کہاں ہے؟“

”اپنے گھر۔۔۔!“

”ہاں۔۔۔“ مسز بیگ نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

”وہ بیچ والا دروازہ کھلا ہے۔۔۔“ اس نے بھاگتے بھاگتے پوچھا۔

”ہاں میں نے تھکوا دیا ہے۔“ مسز بیگ نے کاغذات دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

مسز بیگ کے گھر اور انکیسی کے درمیان ایک کوریڈور تھی جسے ایک مشترکہ دروازہ ایک دوسرے سے ملاتا تھا۔ پچھلے کرایہ دار بہت جھگڑا لوارہے ہوئے لوگ تھے۔ اس لئے مسز بیگ نے دروازہ مقفل کر دیا تھا۔ مگر اب پری کی وجہ سے دوبارہ کھول لیا تھا۔ یہ دروازہ انہوں نے اپنی سہولت کے لئے رکھا تھا تا کہ جب کبھی انہیں دلاؤ وز کے گھر جانا ہو یا بلوانا ہو۔۔۔ تو اسے استعمال کر سکیں۔

”پری۔۔۔ او پری۔۔۔“

چلتی ہوئی دلاؤ وز اس کے گھر میں گھس گئی۔ اندر جا کر حیران ہی رہ گئی۔ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں میز قیامت قالین اور صوفے پڑے تھے۔ پردوں کے رنگ انتہائی موزوں تھے۔ آئینہ، آئینک ٹیبل کے ساتھ چھ کھمبے والی کرسیاں تھیں۔ دی والو بیچ کا فرنیچر اور بھی دیدہ زیب تھا۔ دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ جس سے اسے قطب صاحب کے باذوق ہونے کا صاف اندازہ ہو رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتی پھر رہی تھی کہ ایک دم

بیگ سے کہا۔

”مئی آج میں پری کے پاس جا کے سو جاؤں۔“

”ڈروگی تو نہیں دونوں؟“

”نہیں مئی..... دلا ویز نے منس کر کہا۔ ساتھ والے گھر میں تو آپ ہیں اور دروازے

پر چوکیدار بیٹھا ہے۔“

”صبح جلدی اٹھ جانا، دونوں نے سکول جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے مئی۔“

”اور میں نے آج آپ کو اپنی ڈھیر ساری شاہنگ بھی دکھانا ہے۔ اور میں آپ کے

لئے تجھے بھی لائی ہوں دل باجی.....“

پری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے گھر کی طرف لپک چلی۔

☆.....

گہری نیند میں دلا ویز کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دروازہ کھول رہا ہے۔ کچھ ٹھک ٹھک

ہوئی پھر ہفتی جلانے کی آواز آئی..... اور اندھیرے کمرے میں روشنی کی ایک درز بھی

آگئی..... اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی پری بے سدھ سو رہی تھی۔

مزید بیگ نے ٹھیک کہا تھا اس طرف مت سویا کر ڈگھرا کیا ہوتا ہے، مگر آج پری ضد

کر کے اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی، پچھلے ایک مہینے سے قطب صاحب دورے پر

تھے۔ اور پری رات کو دلا ویز کے کمرے میں جا کر سوئی تھی۔ دن کو دونوں زیادہ تر وقت

ایکسی میں گزارتی تھیں آج شام ہی سے پری بہت اداس تھی، کبھی اپنی امی کی کوئی بات لے

میشیتی اور کبھی ابی کا ذکر کر کے دلگتی، پھر رات ہوتے ہی ضد کرنے لگتی کہ میں اپنے کمرے میں

سوؤں گی۔ دلا ویز نے مزید بیگ سے پوچھا تو انہوں نے کہا:

ہاتھ سے پکڑ کر وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس بیڈروم کا دروازہ ماسٹر بیڈروم
میں کھلتا تھا۔ اس لئے پری اس کمرے میں رہتی تھی۔ پری کا کمرہ سارا گلابی رنگ کا تھا
بیشمار کھلونے اور تصویریں تھیں اسی رنگ کا فرخچہ تھا۔

”اس کا مطلب ہے اب تم گلابی پری ہو گئی ہو۔“

پری تالیاں بجا کے ہنسنے لگی۔

”سارا گھر کس نے بنایا ہے۔“

”چیزیں تو ابی نے خریدی تھیں۔ مگر کچھ لوگ کام کرنے آئے تھے۔“

”بھئی اب تو تم ہمارے گھر نہیں آؤ گی۔“

”کیوں دل باجی؟“

”تمہارا اپنا گھر جو اتنا خوب صورت ہے۔“

”نہیں دل باجی..... ابی مجھے کہہ گئے تھے جب تک میں نہ آؤں تم آنی بیگ کے ہاں

سویا کرنا اور آج تو میں آپ کے گھر آ کے سونے والی تھی۔“

”مگر تمہارا کمرہ اتنا خوب صورت ہے کہ میرا دل چاہ رہا ہے یہیں سو جاؤں۔ اور بھی

مزہ آئے گا۔“

”آؤ چل کے مئی کو بتاتے ہیں۔“

دونوں باہر نکل آئیں باہر آ کر دلا ویز نے پوچھا۔

”یہ تمہارا ملازم ہے؟“

”ہاں دل باجی، خان محمد ابی کا پرانا ملازم ہے۔ وہ اور اس کی بیوی اب ہمارے پاس

آگئے ہیں۔“

خان محمد کو بتا کے وہ دونوں مزید بیگ کے پاس آ گئیں..... کھانا کھا کر دلا ویز نے مسر

یہاں اسی وقت قطب صاحب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولے:

دجیاں کھردے..... وہ ہمیشہ ہی منظم اور منوذب نظر آتے تھے۔ ایک جیسے ان کی کمر بات میں انتشار نہیں تھا وہ سکون سے بولتے تھے۔ تسلی سے سنتے تھے۔ بہت کم بات کرتے تھے۔ بہت زیادہ پائپ پیتے تھے۔ اور ایسے لگتا پائپ کے دھوکے میں اپنی آہیں خارج کر رہے ہیں ان کی آنکھیں بہت خاموش تھیں۔ کبھی پائپ نہیں کہتی تھیں۔ ایسی سہکتی آنکھوں پر دلاؤ ویز کو غصہ آتا تھا ان کے ہونٹوں پر ایک گہری سنجیدگی کی لکیر تھی..... دلاؤ ویز کا دل چاہتا اس لکیر کو ان کی زندگی سے خارج کر دے۔ وہ ایک صاف ستھری روش کی طرح تھے چلتے چلتے جس پر ایک دم لیٹ جانے کو دل چاہتا تھا۔ جس سے لپٹ جانے کو دل چاہتا تھا..... ایسے لگتا سارے زمانے کی عقل ان کے پاس پناہ لینے آ گئی ہے۔ شدت سے خواہش ابھرتی ہے کہ ایسے آدمی کی کوئی بہ تلی دیکھی جائے ایسے لگتا تھا۔ جیسے انہوں نے دنیا میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ ایسا کچھ کہ اب انہیں مزید دیکھنے کی پروا نہیں ہے ایسے لوگوں کی آنکھوں سے سب کچھ چھین لینے کو دل چاہتا ہے۔ جب کوئی شخص بیٹ بھر کر کھانا کھا لیتا ہے تو دنیا کی کسی نعمت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ایسے میں دل چاہتا ہے اس شخص کو فائدے کے عالم میں دیکھا جائے اس کی بے نیازی کا بھرم توڑا جائے۔ اس کا ورق ورق الٹ کے اس کو اندر سے پڑھا جائے۔ ایسے لوگوں کے چہروں پر ایک خوب صورت عنوان لکھا ہوتا ہے۔ اس عنوان کا سارا مضمون پڑھ لینے کو دل چاہتا ہے۔ عجیب ہوتا ہے جیسے یہ لوگ..... کوئی شخص کا آدمی ان کے سامنے ثابت نہیں رہ سکتا..... کمرے میں ایک خوشبو بھیلی ہوئی تھی۔

رات چپ چاپ ایک طرف جا کھڑی ہوئی تھی وہ بیٹھے اپنا پائپ پی رہے تھے۔ مگر خوشبو کے گونگے جھونکے باقاعدہ دلاؤ ویز کی طرف آ رہے تھے۔ گونگے جھونکے اداس ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں قطب صاحب کون سی خوشبو لگاتے تھے۔ ان کی خوشبو ہمیشہ جگر میں آگ لگا دیتی تھی۔

ان کی شخصیت کا حصار بہت مضبوط تھا۔ ایسے لگتا تھا۔ اب انہیں خارجی عوامل۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے سارے دروازے مفصل کر لئے ہیں۔ ان کی فیصلوں پر عقل کی فوج مورچے لگائے بیٹھی ہے وہ اندر باہر سے بے پروا ہو گئے ہیں۔ ایسے میں دلاؤ ویز کے دل کو کچھ کچھ ہونے لگا.....

کبھی کبھی دل قلابازیاں کھانے لگتا ہے۔

اس کا دل چاہا..... وہ اس آدمی کو اٹھائے اور اپنے دل میں بٹھالے اور پھر اچھی طرح اس کا اندر باہر دیکھ لے۔ وہ سب دیکھ لے جو دیکھ لینے کی تمنا ہے۔

”آپ ابھی تک کھڑی ہیں۔ پلیز جا کر سوئیں۔“

”جی میں یہیں سو جاؤں یا اپنے گھر چلی جاؤں.....“ اس نے گہرا کر پوچھا..... یہیں سو جاؤ..... یہیں..... اس بستر پر..... میرے پہلو میں..... اس نیچے پر..... اس سوئے پر..... ان دیواروں پر..... میرے پائپ کے اندر.....

دلاؤ ویز کے اندر آوازوں کا ہجوم اٹھ کھڑا ہوا۔

”جو آپ مناسب سمجھیں وہ کریں۔“ قطب صاحب نے اسی کھردرے لہجے میں اسی سکون کے ساتھ کہا۔ جیسے انہیں تو اس جوان لڑکی سے بالکل کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جوان اور خوب صورت لڑکی جو بغلی کمرے میں درمیان والا دروازہ کھولے ہوئے سو رہی ہے۔

”جی..... اگر اس وقت اپنے گھر کی تو می ڈسٹر بھول گئی۔“

دلاؤ ویز کو اپنے لہجے کی لاجت پر غصہ آنے لگا۔

”میں نے تو یہی کہا ہے جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔“

”جی.....“

دلاؤ ویز کو اپنی ذات حقیر سی نظر آئے گی اس کا دل چاہا آگے بڑھ کر قطب صاحب کا

اور کوٹ اٹھالے۔ اس کو بیٹنگر پر لوٹا کے الماری میں لٹکا دے۔ بڑھ کر ان کا سفید بیڈ کو رانا دے اور ہاتھوں سے بستر کی سلٹوں ٹھیک کرتے ہوئے اپنے ہاتھ بستر پر بچھا دے۔

انہوں نے نظر اٹھا کر دلاؤ ویز کی طرف دیکھا اور شکر مندی سے بولے۔

”پلیز آپ جا کر سو جائیں۔“

”قطب صاحب۔“

دلاؤ ویز نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”آپ اس وقت کچھ کھائیں گے میں

آپ کے لئے کافی بنا لاؤں۔“

”پلیز نہیں۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اور ایک دم کھڑے ہو گئے۔ آپ اس وقت

کوئی زحمت نہ کریں۔ میں سب کھانی کر آیا ہوں۔ ویسے بھی مجھے اپنا ہر کام کرنے کی عادت ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت محسوس کروں گا خود بنالوں گا۔“

کیوں۔۔۔

کیوں۔۔۔

کیوں۔۔۔

دلاؤ ویز کے اندر گولے اٹھنے لگے، کیوں عادت ہے آپ کو اپنا ہر کام کرنے کی یہ

عادت بدلنا ہوئی؟ خبردار اتنے بہادر بن کر نہ رہیں یہ دنیا بہادر لوگوں کے لئے نہیں ہے یہ

دھرتی کمزوروں کی ہے۔ یہاں بہادروں کو زیادہ دن زندہ نہیں رہنے دیا جاتا۔۔۔

انہوں نے کھڑے ہو کر اپنا بیڈ کو رانا اٹھا یا اور اس کو تہہ کرنے لگے۔

”لایئے میں تہہ کر دوں۔“ دلاؤ ویز بے اختیار دوڑ دوڑ آئی ان کے ہاتھوں سے بیڈ کو

لینا چاہا۔ تو ان کے ہاتھوں سے ہاتھ مٹس ہو گئے۔

انہوں نے بیڈ کو تہہ کر کے صوفے پر رکھ دیا اور برہمی سے بولے:

”پلیز آپ ایسا نہ سمجھئے گا میں پہلے ہی آپ لوگوں کے احسان تلے دبا ہوا ہوں۔“

احسان۔۔۔ احسان۔۔۔ احسان۔۔۔ اونہ۔۔۔

احسان تلے دبے ہوئے ایسے ہوتے ہیں کہ ایک خوب صورت اور نوزائیدگی کی طرف

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔

اسی وقت دلاؤ ویز کو احساس ہوا کہ وہ دوپٹے کے بغیر ننگے پاؤں کھڑی ہے اور اسے ذرا

بھی سردی نہیں لگ رہی ہے اور دل اس کا اس طرح دھڑک رہا ہے کہ پسلیاں تو زکڑ کر باہر

آ جائے گا۔

شرمندگی سے چلتی ہوئی وہ پری کے کمرے میں آگئی رضائی اٹھا کے اس میں گھس گئی

مگر کتنی ہی دیر تک اس نے اپنے آپ کو بستر پر محسوس نہیں کیا۔ یوں لگ رہا تھا وہ ہوا میں معلق

ہے۔ جوانی میں یوں تو بستر بہت اچھا لگتا ہے۔ کہ سب نا آسودہ خواہشیں اس کی آغوش

میں پیچھے ہی آسودہ ہونے لگتی ہیں۔ مگر کبھی کبھی بستر فضا میں لٹکی صلیب بن جاتا ہے۔ جب

اپنی تمنا واضح ہو کر سامنے نہیں آتی۔۔۔ قدم غلط ڈگر پر چا پتے ہیں اور پھولوں کی جگہ ہاتھ

تانوں کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ بڑی دیر تک وہ فضا میں لٹکتی رہی۔

اور ساتھ والے کمرے میں سے خوشبودار چھوٹے آگے اس کا منہ چڑاتے رہے دھیمی

دھیمی خوشبو اور ملکی ملکی روشنی دل کا مجید سکول دیتی ہے۔ ساری رات اسے سر بانے کی طرف

پاپ سنائی دیتی رہی۔ کتنی بار قدموں کی آہستہ قریب آئی کتنی بار وہ مضبوط اور مفرور ہاتھ

اس کے دل پر پڑے۔ ایک بار سوتے سوتے وہ پوچھ نکلی۔ اس کا دل چاہا وہ اٹھ کر دیکھے۔

قطب صاحب کیا کر رہے ہیں۔ بستر سے نکل گئی بچوں کے بل چلتی ہوئی وہ دروازے تک

نی۔ بتی جل رہی تھی۔ ذرا سا سر آگے نکال کے دیکھا۔ قطب صاحب گہری نیند سو رہے

تھے۔ انہوں نے سلیٹے سے رضائی ارد گرد پھینکی ہوئی تھی۔ ان کا صرف چہرہ باہر تھا۔ جیسے لمبی

وہ کہتا۔ ”جی جھوٹی بی بی نے بھیجا ہے۔“

تو پری ایک کر پڑ گئی۔ اور کبھی گھبراہٹ، دل ہاجی نے بنا کر بھیجا ہے۔ ابی آپ کھائیں گے۔ کھا کے دیکھیں نا..... دل ہاجی بڑے مزے کے چیزیں بناتی ہیں۔“

کسی شام نوکر میز پر شامی کباب لا کے رکھ دیتا کبھی کبھار پکی ہوئی آ جاتی۔ کسی دوپہر میں کئی کئی روٹیاں اور ساگ آ جاتا۔ کبھی شیر خورہ بھیج دیتی غرض ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی چیز دل ہاجی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چیز پر ضرور ہوتی اور پھر پری مجبور کر کے قطب صاحب کو کھلاتی۔

”ابی آپ چکھ کر تو دیکھیں ہائے ہائے لے لیں نا؟ دل ہاجی کا دل کتنا بڑا ہوگا۔“ اور دوسرے دن مزے لے لے کر وہ دلا ویز کو بتاتی کہ ابی نے بھی کھائی تھی۔

دلا ویز کو قطب صاحب کے سامنے جانے سے ڈر گئے لگا تھا۔ قطب صاحب میں پتہ نہیں کیا تھا کہ ان کے دیکھتے ہی دوز انو ہو جانے کو دل چاہتا۔ حالانکہ انہوں نے تو کبھی نظر اٹھا کر بھی دلا ویز کو نہیں دیکھا تھا۔ اور ان کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے لیے ہال میں یا کئے ہوئے..... وہ کیسا ہنستی ہے، کیسی صورت ہے، کب آتی ہے۔ کب جاتی ہے، مگر وہ قطب صاحب کی ہر خبر کھتی تھی، دو تین مہینے گزر گئے تو ایک دن اس نے قطب صاحب کی الماریاں کھول کر دیکھیں اور بولی:

”آپری تمہارے ابی کے کپڑے ٹھیک کر دیں۔“

پری کو تو اس نے برائے نام ساتھ لگا لیا تھا اس نے خود ہی قطب صاحب کی وارڈ روپ صاف کی۔ جن قمیضوں کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ وہ لگائے، مرمت طلب کپڑے مرمت کئے، انہیں استری کر کے الماری میں لٹکا دیا۔ سارے جو تے پاش کئے اور ترتیب سے شوریک میں رکھ دیئے شام کو قطب صاحب آئے اور جب اپنے کپڑے الماری میں

مسافت کے بعد مسافر تھک بار کے سو جاتا ہے۔ سائیڈ ٹیبل پر ان کا پائپ، تمباکو کی تیلی اور لائٹر بڑا تھا۔ اور پائپ میں سے ابھی تک بکا بکا دھواں نکل رہا تھا۔ اس وقت کوئی پائپ نہیں پی رہا تھا..... مگر شاید پائپ کو اس کی طرح سلگنے اور دھواں اگلنے کی عادت ہو گئی تھی۔ یہ دھواں تو اپنے آپ جھڑپتا ہٹا اٹھا کر چل دیتا..... اس دھوئیں نے تمام شب اسے سونے نہیں دیا..... یہ دھواں بیانی نہیں تھا.....

سارے گھر میں عجیب بے چینی تھی اور اداسی درو دیوار پر جاگ رہی تھی اور قطب صاحب مزے سے سو رہے تھے جس کے دل میں سکون نہ ہو..... وہ شخص اتنے مزے سے کیوں سو جاتا ہے۔ اس کا دل چاہا، جا کے قطب صاحب کے بال اپنے ہاتھوں سے پریشان کر دے اور انہیں گر بیان سے پکڑ کر جگا دے۔

گراس نے اپنے سلیپر پہنے دوپٹے بستر سے نکال کر اوڑھا اور چپکے سے باہر نکل آئی۔ کوریڈور پارکر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆.....

نہ جانے کیا ہوا کہ صبح دلا ویز اپنی نظروں سے آپ جھپٹی پھرتی تھی۔ ایسے لگتا جیسے دل میں کوئی چور کھڑی کھل گئی ہے۔ صبح اس نے اپنے آپ کو ایک بدلی ہوئی لڑکی پایا۔ جہاں جاتی خوشبو کا وہ گرم گرم جھونکا اس کے ساتھ جاتا۔ کسی کے ساتھ بات کرتی تو گہری سنجیدہ سفاک آنکھیں اسے یاد آ جاتیں۔ چلتے چلتے رک جاتی۔ جیسے کسی کی شبیہ نے راستہ روک لیا ہو عجیب طرح قطب صاحب کا بھوت سر پر سوار ہو گیا تھا پھر کئی دن تک وہ پرنی کے گھری نہ جاسکی البتہ کچھ نہ کچھ پکا کر ضرور بھیج دیتی۔

عین کھانے کے وقت نوکر کوئی دھکی ہوئی دُش لے کر آ جاتا۔ قطب صاحب پوچھتے۔

”کیا ہے؟“

”پری میرے کمرے میں گلدان کہاں سے آیا؟“

”او!“ پری ایک دم سے دونوں ہاتھ جوڑ کے بولی۔۔۔۔۔ ”رات آپ بہت دیر سے آئے تھے ابی۔“

”ہاں بیٹا! کچھ کام تھا۔“

”ہم نے آپ کو سر پرانز دینا تھا۔“

”ہم کون؟“

”میں نے اور دل باجی نے۔“

”کیسا سر پرانز؟“

”کل آپ کی سالگرہ تھی آپ کو کچھ معلوم ہے۔“

”نہیں بیٹا۔ اب مجھے ایسی باتیں یاد نہیں رہیں۔“

”میں نے دل باجی کو بتایا تھا تو انہوں نے کہا تھا ’آؤ سالگرہ کا ایک بنائیں، ہم نے شام کو کیک بھی بنایا تھا اور آپ کا نام لکھا تھا دل باجی دیر تک بیٹھی رہی تھیں۔ مگر آپ نہیں آئے تو وہ چلی گئیں۔“

”لیکن یہ گلدان کہاں سے آیا؟“

”ہاں یہ گلدان دل باجی لائی تھی۔ اسی طرح پھول لگا کر۔۔۔ یہ آپ کی سالگرہ کا تحفہ ہے۔ انہوں نے دیا ہے۔“

پری جب سکول چلی گئی تو قطب صاحب نے ملازم کو بلا کر کہا۔ ”یہ گلدان ان کے کمرے سے اٹھا لے جائے اور ڈرائنگ روم میں رکھ دے۔ آئندہ ان کے کمرے میں پھول نہ رکھے جائیں۔“

دل ویز نے سنا تو اسے یوں لگا ریت میں دھنسی چلی جا رہی ہے۔ معلوم بھی ہوتا ہے کہ

لٹکانے لگے تو چونک گئے پھر انہوں نے پری کو آواز دی۔

”یہ میری الماری کس نے ٹھیک کی ہے۔“

”میں نے اور دل باجی نے۔“

ناگواری کا ایک سایہ ان کے چہرے پر آ گیا۔ کہنے لگے:

”بیٹا تم میری چیزوں کو ہاتھ مت لگایا کرو ڈان میں میرے ضروری کاغذات ہوتے

ہیں۔ تم ہو گئے تو میں یونہی چلاؤں گا۔“

”میں نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا ابی۔۔۔۔۔ پری دیانت داری سے بولی: ”سب کچھ دل

باجی نے خود کیا ہے۔ بس میں کھڑی دیکھتی رہی۔“

”خیر۔۔۔ اپنی باجی کا شکر یہ ادا کر دیتا۔“ انہوں نے تلخی سے کہا، مگر میرے کمرے کی کوئی چیز نہ چھیڑا کرو۔“

اگلے دن پری نے ساری بات دل ویز کو بتادی۔ دل ویز ایسی باتیں نہ کر اور بھی بے سکون ہو جاتی۔ قطب صاحب جتنی مستعدی سے No Entry کا بورڈ لگاتے تھے دل ویز کا دل چاہتا۔ ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرے تاکہ بڑے زور کا دھماکہ ہو جائے۔

☆.....

ایک دن قطب صاحب رات گئے کمرے میں آئے تو ان کے خالی خالی کمرے میں ایک نازک سا کانچ کا گلدان پڑا ہوا تھا۔ گلدان میں سرودی دو شاخیں تھیں اور شاخوں کے ساتھ ایک خوب صورت کھلا ہوا گلاب اور ایک ننھی سی ادھ کھلی کانچ لگی ہوئی تھی۔ گلدان بھی خوب صورت تھا۔ اور پھولوں کی آرائش بھی۔۔۔۔۔ آرائش کے پیچھے جو خیال تھا۔ وہ قطب صاحب کو پسند نہیں آیا۔ اٹھ کر پری کے کمرے میں گئے وہ سوچتی تھی، صبح ناشتے پر انہوں نے پوچھا۔۔۔

ریت پر پاؤں نہیں ٹک سکتے، بعض اوقات ریت کے اندر دھنس جانے میں ہی مرہ آنے لگتا ہے۔

پھر ایک دن دلا ویز نے پری سے پوچھا۔

”پری سارے گھر میں تمہاری امی کی کوئی تصویر نظر نہیں آتی، کیا وہ تصویر کچھ چھپواتی تھیں۔“

نہیں بابی..... میری امی کے تو بڑے بڑے پورٹریٹ تھے اور شادی کی سالگرہ ہر ہر دفعہ امی اور ابی تصویر کچھ چھپواتے تھے، مگر امی نے ابی کی ساری تصویریں ایک صندوق میں بند کر کے رکھ دی ہیں وہ کہتے ہیں۔ ابھی مجھ میں حوصلہ نہیں ان تصویروں کو دیکھنے کا..... میرے کمرے سے بھی انہوں نے تصویر اتار لی ہے..... میں نے شور مچایا تھا تو انہوں نے کہا تھا جو لوگ دل میں رہتے ہوں..... اور جن کی صورت ہر وقت نظر کے سامنے ہو۔ ان کی تصویریں سامنے رکھنا۔ ان کی تو جین کرنا ہے۔“

”تو جین کیا ہوتی ہے دل بابی۔“

پری نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

”تو جین..... دل چونک لگی“ اپنے جذبات کسی ایسے شخص کی سمیٹ چڑھانا جسے ان کی پروا نہیں..... تو جین کہلاتا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں دل بابی۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آئی۔“

دل سوگوار سے مسکرائی، ”تمہیں کچھ نہیں کہہ رہی۔ میں تو اپنے آپ سے باتیں

کر رہی تھی۔“

”دل بابی! کچھ دنوں سے آپ بس اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی ہیں۔“

”تم نے کیسے جانا؟“

”میں بات کرتی ہوں۔ آپ سنتی ہی نہیں، بس اپنے آپ سے بولے جاتی ہیں۔“

”نہیں پری میں تو تمہاری ہر بات سنتی ہوں“ دل نے پری کو سینے سے لگایا۔ اور پھر

تھوڑی دیر بعد اٹھ آئی۔

دلا ویز نے خلوص دل سے کوشش کی تھی کہ یہ جو سینے میں طوفان اٹھ رہے ہیں ان کو یہیں دبا دے۔ شیشے کی ڈگر پر نہ چلے۔ اور انہونی باتوں کی خواہش نہ کرے اس لئے وہ مہینوں قطب صاحب کے ہاٹے نہ آتی۔ ہفتوں پری کے کمرے میں نہ جاتی کسی نہ کسی طرح بات بنائے رکھتی۔ مگر پھر بھی کسی دن آتے جاتے ہوئے دور و نزدیک سے اس کی نظر قطب صاحب پر جا پھرتی، وہ اپنی خود اعتمادی کے حصار میں ظالم بن کر بیٹھے ہوتے..... اور گرد سے بے نیاز..... ساری دنیا سے بے پروا..... تب اسے بے تحاشا رونا آنے لگتا..... آخر ایک آدمی کے آگے انسان اتنا مجبور کیوں ہو جاتا ہے، کتنے عجب ہیں دنیا کے کھیل.....

ان واموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اس نے توحید کے ہر خط کا جواب دیا تھا مگر کیا کرتی..... خط توحید کو لکھتی اور شبیہ سامنے قطب صاحب کی آ جاتی قطب صاحب کی بے حسی میں ایک کشش اور ان کی اداس و سنجیدہ آنکھیں ظلم کی انتہا تھیں پتہ نہیں وہ آنکھیں جو اس کی سمت دیکھتی نہیں تھیں اس پر ظلم کیسے کر جاتی تھیں۔

دلا ویز نے ہر پہلو سے سوچا تھا، ایک سال اسی کشش میں گزرا تھا، ایک سال کی رسمہ کشی نے اسے زندہ حال کر دیا تھا۔ اس دوران ایک بار توحید بھی چھٹیوں میں گھر آیا تھا..... ان دنوں وہ خوب توحید کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔ فلمیں دیکھتی تھی۔ ہوٹلوں میں جاتی تھی، مگر فلم دیکھتے دیکھتے ایک بارگے دواداس اور ظالم آنکھیں پوری سکرین پر چھا جاتیں۔ گہری چپ میں ملوف و ہونٹ سامنے آ جاتے۔ ایک معطر وجود..... سلیطے سے بنا سنورا..... شکن سے بے نیاز اس کے احسان پر چھا جاتا..... یا ہوٹل کی میز پر توحید کی لائینی باتیں سنتے سنتے

پری نے حیران ہو کر پوچھا۔

تو اسے سمجھ نہیں آئی کیا جواب دے..... کیا کہہ دے کہ اب اس کے دل میں چور ہے یا اب وہ اپنی نظر میں دل آشرمند ہی پھر رہی ہے۔ مگر جلدی سے بات بنا کر بولی:

”اب آپ کے ابلی مستقل یہاں رہتے ہیں۔ اس طرح میرا یہاں سونا بری بات ہے۔“ کوئی بری بات نہیں باقی میں ابلی سے کہہ دوں گی میں نے آپ کو یہاں سلا یا ہے۔“
”تمہارے ابلی کی بات نہیں..... ویسے بری بات ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟“
”کیوں اس میں بری بات کیا ہے؟“

”تم ابھی نہیں سمجھ سکتی ہو پری..... بس میں یہاں نہیں سو سکتی۔“

”ہائے دل باجی..... آپ بتائیں نا؟ ورنہ میں رو پڑوں گی۔“

”پری! تم ابھی چھوٹی ہو ہمارے ہاں کنواری لڑکیوں کو کسی کے گھر رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“

”اچھا۔“

پری نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”پھر کیا ترکیب کی جائے کہ آپ یہاں سونے پر رضامند ہو جائیں۔“

”بھئی تم ہی کوئی ترکیب کرو۔“

پری تھوڑی دیر سوچتی رہی..... پھر ایک دم اچھل کر بولی۔ ”ایک ترکیب آگئی ہے۔ میرے ذہن میں.....“

”کیا.....“ دلا ویرن بس کر بولی۔

”اگر آپ کی شادی ابلی سے کر دی جائے تو آپ یہاں سو سکتی ہیں؟“

دلا ویریوں اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے کسی نے اس کے سینے میں بھالا اتار دیا ہو خوفزدہ انداز

وہ اپنے سامنے قطب صاحب کی تمنا کر بیٹھتی اور رات کو سوتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پچکے پچکے ننگے پاؤں اس کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ جس کمرے میں دھواں آہستہ آہستہ گرا رہا ہے۔

درو دیوار پر ایک پراسرار خوشبو بیٹھی ہے۔ یہ آہستہ خوشبو ہے۔ جو قریب جاتا ہے۔ اس سے لپٹ جاتی ہے۔
جانے کیوں ہر روز رات کو وہ چپکے چپکے اپنے دل کو اس کمرے میں جانے سے نہ روک سکتی تھی۔

اس کا قطب صاحب سے کوئی ناٹ نہیں تھا۔ قطب صاحب اس قفل کی مانند تھے جو بند ہو کر جس کی چابی کھو گئی ہو۔ جن تالوں کی چابی کھو جاتی ہے۔ بوقت ضرورت انہیں توڑ دیا جاتا ہے۔ مگر اس میں اس قفل کو توڑنے کی ہمت نہ تھی..... اور کیا ضرورت تھی اسے بھلا یہ رنگ آلود قفل توڑنے کی، مقفل کمرے کے اندر جو خزانہ تھا۔ وہ کسی اور کا تھا۔ کسی اور کا سرمایہ تھپایا بڑی بری بات ہے۔ وہ جانتی تھی۔
مگر اپنے اوپر کوئی زور نہ چلتا۔

☆.....

بہت دنوں کے بعد پری زبردستی اسے اپنے کمرے میں گھسٹ کر لے گئی۔ وہ چاہتی تھی قطب صاحب کے آنے سے پہلے وہ اپنے گھر آجائے۔ کیونکہ بھران کے آنے کے بعد ان کے کمرے سے گذر کے آنا پڑتا جو اسے پسند نہیں تھا اور نہ وہ قطب صاحب کا سامنا کرنا چاہتی تھی لیکن پری بھنڈی تھی کہ آج وہ اس کے ساتھ ہی سوئے۔

”پری! اب میں تمہارے کمرے میں نہیں سو سکتی۔“

”اب کیا ہوا ہے دل باجی!“

میں اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر اپنے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور کچھ بھی نہیں کہا۔

”کیوں کسی ہے یہ ترکیب.....“ پری ایک دم اس کی گود میں چڑھ آئی اور اس کا جھکا ہوا منہ اٹھا کر پوچھا۔ ”اب شر مار ہی ہیں آپ؟“

”پری.....“ دلا ویز نے خوف زدہ انداز میں کہا۔ ”خدا کے لئے یہ بات کسی اور کے سامنے نہ کہہ دیتا۔“

”کیوں کیا یہ بری بات ہے۔“

”بری بات ہے یا نہیں..... اگر تمہارے ابی نے سن لی تو جان سے مار ڈالیں گے۔“

”کس کو؟“ پری نے پھر مصحوبیت سے پوچھا۔

”مجھے.....“ دلا ویز نے اسی انداز میں کہا۔

”ارے آپ ابی سے اتنا ڈرتی ہیں۔ میں نہیں ڈرتی..... میں یہ بات ابی سے بھی کہہ سکتی ہوں۔“

”مگر ایسا کہنا نہیں پری.....“ دلا ویز کے دل کے اندر چھپا ہوا چور چور پھڑپھڑانے لگا۔

”اچھا! مگر ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط.....؟“

”پہلے آپ یہ بتائیں اس طرح آپ ہمارے گھر سو سکتی ہیں نا؟“

”ہاں ہاں..... مگر یہ بات کہنے کی نہیں ہے پری.....“

”لیکن آپ کو یہاں سنانے کے لئے کچھ تو کرنا پڑے گا۔“

”پری..... اپنے ابی کو مست تیار کرو کہ میں یہاں آتی ہوں۔“

”کیوں نہ بتاؤں.....“

”پری..... تم نہیں جانتیں وہ مجھے سخت ناپسند کرتے ہیں۔“

”میں ابی سے پوچھوں گی وہ آپ کو کیوں ناپسند کرتے ہیں۔“

”بے وقوف.....“

یہ کہہ کر دلا ویز بنس پڑی۔

”تمہارے ابی بہت بڑے آدمی ہیں..... وہ چھوٹی چھوٹی باتیں پسند نہیں کرتے ان کو چھوٹے لوگ اچھے نہیں لگتے؟“

”مگر میں بھی تو اتنی چھوٹی ہوں..... مجھ سے تو وہ بہت پیار کرتے ہیں.....“

”تم ان کی بیٹی ہو..... پری..... بیٹیوں سے تو سب باپ اسی طرح پیار کرتے ہیں۔“

”آپ کے ابی نہیں ہیں دل باجی۔“

”نہیں پری۔“ دلا ویز نے اداسی سے کہا۔ ”میں بہت چھوٹی تھی۔ جب وہ فوت ہو گئے مجھے تو ان کی شکل بھی یاد نہیں۔“

”اسی لئے..... اسی لئے.....“ پری داناؤں کی طرح سر ہلا کر بولی۔ آپ میرے ابی کو چھپ چھپ کر دیکھتی ہیں۔“

”پری.....“ دلا ویز کا دل چاہا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے مگر اپنا ہاتھ روک گئی۔

اور بولی:

”تمہیں کس نے کہا ہے.....؟“

”لوجی کیا میں دیکھتی نہیں..... آپ بیلوں اور پودوں کے پیچھے سے کبھی بازو کے پیچھے سے انہیں دیکھ لیتی ہیں۔ کبھی جھانک لیتی ہیں۔ آپ کو میرے ابی اچھے لگتے ہیں۔“

”ہاں پری..... تمہارے ابی اچھے جو ہیں۔“ دلا ویز نے بہت آہستہ سے کہا۔ اچھے لوگ تو سب لوگوں کو اچھے لگتے ہیں..... اور تم بڑوں والی باتیں مت کیا کرو۔“ دلا ویز کھڑی ہو گئی۔

آج پری کو بلائے بغیر ہی چلی جائے۔ یہ سوچ کر وہ مڑی۔ اسی وقت قطب صاحب نے پکارا:

”دلاؤ ویز۔“

دلاؤ ویز..... دلاؤ ویز..... دلاؤ ویز.....

جیسے سارا گھر اسے آواز دینے لگا۔ یہ بھی اسے اپنے فہم کا وادہ دی لگ رہا تھا جب انہوں نے فوراً دوسری آواز دے ڈالی اور کہا:

”دلاؤ ویز اندر تشریف لائے۔“

حالانکہ ان کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ پتہ نہیں انہوں نے کس طرح دلاؤ ویز کو دیکھ لیا تھا۔ دل تو اس کا چاہا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ مگر یہ بڑی بیہودہ حرکت تھی اسی لئے سہی سکڑی بچوں پر چلتی ہوئی ریکٹ کی پشت پر دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے وہ آگئی۔

”تشریف رکھیے۔“

قطب صاحب نے اس کی طرف دیکھے بغیر کرسی کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ کنارے پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے ابھی اٹھ کر دوڑ جائے گی۔ قطب صاحب تھوڑی دیر پا پ پیتے رہے اور وہ جوتے کے اندر اپنے پاؤں کو توڑتی مروڑتی رہی..... پھر رفتہ رفتہ دلاؤ ویز نے نگاہ اٹھائی..... قطب صاحب کا چہرہ وہاں ہی تھا۔ جیسا ہمیشہ ہوتا..... صاف چمکدار..... چپ چاپ پر اسرار..... مگر تڑپا دینے والا..... ان کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ ان کا وجود جیتا جاگتا تھا۔ ان کے پیکر میں دل بھی دھڑکتا تھا۔ مگر وہ آسمان کی طرح بلند اور بے حس نظر آ رہے تھے..... اور جب دلاؤ ویز ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسی وقت انہوں نے پا پ منہ سے ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر دلاؤ ویز کی نگاہ ان کی خالی خالی نگاہ سے ٹکرائی پھر دلاؤ ویز نے نظرس جھکا لیں.....

”آخر مجھے بھی تو بڑے ہونا ہے دل باجی..... کہاں چلیں دل باجی.....“ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

باہر کار کرنے کی آواز آئی ہے اب مجھے جانے دو اور پری کے کچھ کہنے سے پہلے دلاؤ ویز باہر نکل گئی۔

.....☆.....

ٹینس کا ریکٹ گھماتے ہوئے دلاؤ ویز کوریڈور میں آ گئی۔ وہ اور پری دونوں ٹینس کھیلا کرتی تھیں۔ پری کو تو بس یونہی لے جاتی تھی مقصد اس کا اپنے آپ کو تھکانا اور شل کرنا ہوتا تھا..... کوریڈور میں قدم رکھا تو جانا پہچانا غیر محسوس سا دھواں چاروں طرف نظر آیا..... اور مانوس سی خوشبودر دیوار پر بیٹھی تھی۔ یہ وقت قطب صاحب کے آنے کا نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ چلے جاتے تھے پھر رات کے گیارہ بجے آیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ شام کو بڑی بے تکلفی سے پری کے کمرے میں آ جاتی تھی۔ لیکن اس وقت کسی خوف نے اس کے قدم پکڑ لئے۔ تھوڑی دیر کھڑی اپنے کیونس کے جوتوں پر ریکٹ مارتی رہی۔ پھر اس نے سوچا۔ ذرا سی گردن بڑھا کر لابی میں دیکھ لی۔ اس وقت اس خوشبو کا یہاں کیا کام.....

جونہی گردن نکال کر دیکھا، جھٹکے سے پیچھے ہو گئی۔ واقعی قطب صاحب سامنے آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ اسی طرح منہ کے ساتھ پا پ لگا رکھا تھا۔ ساری آہیں جنونیں کی صورت ادھر ادھر چھوڑ رہے تھے۔ پتہ نہیں کس طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر کے زاویے کبھی نظر نہیں آئے تھے مگر وہ دلاؤ ویز کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہے تھے۔

دلاؤ ویز وہیں کوریڈور میں رک گئی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نہ جانے قطب صاحب کو دیکھنے کے بعد ہریت دیر تک وہ اپنے آپ پر قابو کیوں نہیں رکھ سکتی تھی۔ تھنڈی برف ہو جاتی، سانسیں ڈوبنے لگتیں۔ مگر دل دھڑکنے لگا۔

زندگی سے نکال ہی نہیں سکتی وہ اپنی ماں کا صدمہ سہہ چکی ہے اس کا دل بہت نازک ہو گیا ہے۔ اگر اس کی زندگی سے کچھ اور چھین لیا گیا تو وہ کیسے زندہ رہے گی!۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔ مجھے پتہ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتی تھی ورنہ میں پری سے اتنی محبت نہ کرتی۔“

دلا ویز ابھی تک رو رہی تھی۔

”لیکن اب کیا کیا جائے؟“

”جی۔۔۔۔۔ جو آپ کہہ دیں گے میں کروں گی۔“

”کیا آپ اس کے دل سے اپنی محبت نکال سکتی ہیں؟“

دلا ویز نے اپنی روٹی ہوئی خوب صورت اور گیلی گیلی آنکھیں اٹھا کر قطب صاحب کی طرف دیکھا۔

ان کی نگاہیں انجان تھیں اور کتنی سفاک نظر آ رہی تھی۔

اور محبت تو یونہی آ سب کی طرح آ کے چمٹ جاتی ہے۔ قطب صاحب کو اپنی بیٹی کا بہت فکر ہے۔ کسی دوسرے کی بیٹی کا غم نہیں۔۔۔۔۔ آسمان بن کے میری جانب نہ دیکھئے۔

دل میں درد رکھے ہیں تو مسیحا بن کر نبض پر ہاتھ رکھیے۔

دلا ویز کا دل چاہا کہ وہ ایک ننھی سی بیٹی بن کر قطب صاحب کے دل میں جا بیٹھے۔۔۔۔۔ اور اس چٹان کو پاش پاش کر دے۔ جو احساسات کے طوفان سے بے نیاز بنی کھڑی ہے اور جس پر پاؤں تک نہیں ٹک سکتا۔

”آپ نے خواہ خواہ میری زندگی میں آنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ حالانکہ میں اپنی زندگی میں سب کچھ ہار چکا ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ دینے کو۔ اور آپ بالامال ہیں۔ اپنے کسی ہم عمر کا انتخاب کر سکتی ہیں آپ کی مہربانیوں نے مجھے سکھ بھی دیا اور تکلیف بھی

بڑے سکون مگر بڑی بے دردی سے قطب صاحب بولے۔

”دلا ویز! آپ کو معلوم ہے پچھلے ایک ماہ سے پری مجھ سے ناراض ہے۔“

”جی نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اس نے ایسی کوئی بات مجھے نہیں بتائی۔۔۔۔۔“

”لیکن آپ یہ بھی تو پوچھیں کہ وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے۔“

”کیوں ناراض ہے؟“ سحر زدہ سی دلا ویز اسی طرح بولی۔

”پری نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ شادی کر لوں۔“

”قطب صاحب۔“

ریکٹ دلا ویز کے ہاتھوں سے نیچے گر گیا۔ اور وہ جھرجھرو نے لگی۔

”یہ سب کیسے ہوا۔“ قطب صاحب نے پوچھا۔

”پتہ نہیں جی۔۔۔۔۔ دلا ویز نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔

”پری بچی ہے، معصوم ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے اس سے کہا

کہ میرا آپ کا کوئی جوڑ نہیں۔ مجھے شادی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دنیا کی کسی عورت سے

شادی نہیں کر سکتا۔ مگر وہ ایک ہی ضد کرتی رہی۔ میں نے بارے سمجھا یا دھمکا یا تنبیہیں کیں اور

اب وہ رات کو مجھے پیار کرنے نہیں آتی، صبح مجھے خدا حافظ کہہ کر نہیں جاتی۔ دلا ویز آپ تو

جانتی ہیں۔ ایک بیٹی ہی تو میرا کل سرمایہ ہے۔ آپ میرا سرمایہ بھی چھین لینا چاہتی ہیں۔“

روتے روتے دلا ویز نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور گلا صاف کر کے بمشکل بولی:

”قطب صاحب! آپ مجھ سے قسم لے لیں۔ میں نے کبھی ایسی کوئی بات پری سے

نہیں کہی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ اسی اداسی سے بولے۔

”مگر آپ نے پری کو اتنی محبت کیوں دی۔ اس پر اتنی توجہ کیوں کی کہ اب وہ آپ کو اپنی

”آپ یہ کیوں سمجھ رہے ہیں، ہر کوئی کچھ حاصل کرنے کے لئے قریب آنا چاہتا ہے۔“

”اور قریب آنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“

”کچھ لوگ صرف دینے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔“

”یہ غلط ہے..... دلا ویز..... عورت سمجھتی ہے وہ صرف چاہے جانے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ جب وہ کسی مرد کے قریب جاتی ہے تو صرف اس لئے کہ اسے چاہا جائے پوجا جائے۔“

”سب عورتیں ایک ہی نہیں ہوتیں۔“ قطب صاحب۔

دلا ویز سب عورتیں ایک ہی ہوتی ہیں عورت مرد کے پیار کی بھوکی ہے، اسے دنیا کی ہر نعمت دی جائے مگر مرد کا پیار نہ ملے تو وہ مر جاتی ہے۔“

”میں کہتی ہوں۔ قطب صاحب! عورت مرد سے پیار کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ بھر پور انداز میں مرد سے محبت کر سکتی ہے۔ اسے سب کچھ دے سکتی ہے مگر کسی ذاتی غرض سے بے پروا ہو کر بغیر سودے بازی کے.....“

”ہاں اس مرد کو جسے ان سب چیزوں کی تمنا ہو مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں ہے۔“

”مجھے تو ہے۔ قطب صاحب!“

”کیا.....؟“

”کہ میں آپ کے قریب رہوں! آپ کی خدمت کروں! آپ کی زندگی کے غم بانٹ

لوں۔“

”بعض غم ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ان میں کسی کی شرکت بھی گوارا نہیں کرتا۔ اور

چہرہ

وہ جلدی سے بولے:

پہنچائی۔ ایسی تکلیف جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ میرے غم میری ذات کا حصہ ہیں۔ اپنی ذات کی طرح ان سے بھی پیار ہے۔ آپ کیوں کسی ویران مکان میں رہنا چاہتی ہیں۔“

دلا ویز پھر زار و قطار رونے لگی۔

باہر شام کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا تھا، اور شام کی چڑیاں درختوں پر زور زور سے چہچہا رہی تھیں۔ گویا دن کے اس آخری اجالے کو الوداع کہہ رہی تھیں۔

افق پر پرندوں کے غول گزر رہے تھے، دور دور سے انجانی سی آوازیں آرہی تھیں۔ شام ایک تھکے ہوئے پرندے کی مانند اپنے سیاہ پر پھیلائے دھیرے دھیرے بے نیچا تر رہی تھی، ایسے میں دل یوں بھی میٹھے لگتا ہے۔ تنہائی ڈسنے لگتی ہے اور جی چاہتا ہے۔ کوئی پیارا اپنے قریب ہو۔

دلا ویز نے ایک سال سے آنسو روک رکھے تھے۔ اور آج آنسوؤں کی نہریں بہا دینا چاہتی تھی۔ قطب صاحب کس قدر قریب بیٹھے تھے۔ مگر کتنی دور کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے وجود سے ایک مہک اٹھ کر دلا ویز کی طری آرہی تھی۔ جو صاف کہہ رہی تھی۔ آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔

وہ بڑی بے نیازی سے میڑھے میڑھے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں ان کے جوتوں سے باہر تھے اس وقت جراثیم نہیں پہنچی ہوئی تھیں ان کے پاؤں نہایتا کتنے سفید تھے۔ دلا ویز کے دل میں یہ پاؤں پلچل پچانے لگے۔ اس کا دل چاہا وہ اپنے آنسوؤں سے بھرے ہوئے رخسار قطب صاحب کے پاؤں پر رگڑے تب شاید ان کے دل میں درد کی کوئی لہر اٹھے۔

”دلا ویز میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔“

”قطب صاحب۔“

بالآخر دلا ویز نے گلا صاف کیا اور اپنی آواز پر قابو پا کر بولی:

میرے ساتھ الجھ کر اور لڑ کر سو گئی ہے۔ اسی لئے میں نے سوچا تھا میں آج آپ سے بات کروں گا۔“

دلّٰویز کچھ اور بھی سننا چاہتی تھی، مگر وہ خاموش ہو گئے اب وہ نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔ صرف ان کے پائپ سے نکلنے والا دھواں تیار ہا تھا کہ وہ کدھر بیٹھے ہیں۔
”میں سمجھتا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد وہ اسی پر سکون انداز میں بولے: ”زندگی کے مشکل موڑ گذر چکے ہیں..... مگر عجیب بات ہے۔ ہر بار ایک دورا ہا سامنے آ جاتا ہے۔“
”قطب صاحب“ کیا دنیا میں کسی مرد نے اپنی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی۔ بلکہ مرد تو پہلی بیوی کی موجودگی میں شادیاں کر لیتے ہیں۔“

”شادی کیا ہوتی ہے؟..... پتہ نہیں کیا ہوتی ہے..... میں تو اپنے آپ کو تنہائی کی سزا دینا چاہتا ہوں میں تو اپنے آپ کو بن باس کا حکم سنائے بیٹھا ہوں آپ کیا جانیں کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔“

”میں آپ سے پوچھنے کی جرات تو نہیں کر سکتی، لیکن ایک سال ہو گیا آپ کو بن باس کاٹنے ہوئے اپنے آپ کو سزا دیتے ہوئے..... کیا ابھی آپ کی سزا پوری نہیں ہوئی۔“
”میری سزا میری زندگی کے ساتھ پوری ہوگی۔“

”اگر کوئی آپ کے ساتھ مل کے یہ سزا کاٹنے پر آمادہ ہو تو.....“
”دلّٰویز عمر قید کی سزا کاٹنا آسان نہیں ہوتا..... اور مجھے تو کسی کی آرزو ہی نہیں.....“

”میں جانتی ہوں آپ بار بار نہ کہیں۔“
”لیکن مشکل میں پھنس گیا ہوں۔“

دلّٰویز چپ رہی۔

”میں نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے اب میں صرف اپنی بیٹی کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کی بیٹی کو زندگی کے کچھ سہارے درکار ہیں۔“
”ہاں.....“

یہ کہہ کر قطب صاحب پھر پائپ پینے لگے، گویا خلاء میں گم ہو گئے۔ دلّٰویز بہت روچکی تھی اپنے دوپٹے کا پلو پکڑ کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ دونوں دیکھ رہے تھے کہ شام گہری ہو گئی ہے۔ لابی میں اندھیرا اتر آیا ہے، مگر دونوں میں سے کسی نے بھی اٹھ کر جتنی جلانے کی کوشش نہیں کی، دونوں ہی غائب ایک دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک دوسرے کے وجود کو محسوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک دوسرے کی روح سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔

دلّٰویز کو پتہ نہیں کیا ہوا کہ اس کے دل میں قطب صاحب کی ساری روح اتر گئی۔ گہری شام کے سائے میں بیٹھ کر اس نے سوچا اگر قطب صاحب کا ساتھ میرا جائے تو وہ زندگی ان کے قدموں میں بتا دے گی وہ قطب صاحب کو محسوس کرنا چاہتی تھی ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر..... ان کے چہرے کو..... ان کی آنکھوں کو..... ان کے ہونٹوں کو قطب صاحب اپنے ہی وجود میں کہیں چھپے ہوئے تھے، مگر اسے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ ان کے جسم کا ایک حصہ بن کر ان کو کھوجنا چاہتی تھی۔ وہ ایسا گہرا سمندر تھے کہ ان میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔ وہ کیوں ناممکن بنے بیٹھے تھے..... ذرا سی دیر کو وہ مرد کیوں نہیں بن جاتے تھے اگر مرد بن جاتے تو اس کے تجسس کی ساری راہیں بند ہو جاتیں۔ اور وہ ان کے حصول کا خیال دل سے نکال دیتی۔

”پری کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں آج دوپہر کے بعد دفتر نہیں جا سکا۔ وہ

”اچھا..... اگر یہ امتحان ہے..... تو..... یونہی سی“ قطب صاحب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور انہوں نے اپنے پاؤں اپنے جوتوں میں ڈال لئے۔ ”میں پہلے پری کوراضی کروں گا۔ پھر آپ کی امی سے بات کروں گا۔“

☆.....

دلّٰ ویز گلابی ساڑھی کا پلو سر پر ڈالے اسی سادہ سے کمرے میں سر بیٹھوڑائے بیٹھی تھی۔ اف تو بہ اس کمرے میں اس طرح بیٹھنے کے لئے اس نے کتنے آگ کے سمندر پار کئے تھے اور کتنی مخالفت کی آندھوں کو جھیلنا تھا۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔ جب قطب صاحب نے رشتے کی بات چلائی، تو سب سے زیادہ اس پر مسز بیگم جڑیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔ ”یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے اب میں تو حید اور اس کے باپ کو کیسے منہ دکھاؤں گی۔“

”مُمی آپ صرف اپنی بیٹی کی خوشی کی بات کریں۔ قطب صاحب بھی تو ہیں جو اپنی اکلوتی بیٹی کی خوشی کے لئے اتنا بڑا قدم اٹھا رہے ہیں۔ ایک آپ ہیں۔ آپ کو ہمیشہ دوسروں کی خوشیوں کا خیال ہوتا ہے۔“

”دل اس دنیا میں رہ کر دوسروں کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم صرف اپنے بارے میں سوچتے رہیں تو دنیا جہنم بن جائے گی اور جب سے تم پیدا ہوئی ہو۔ تمہارے تایا جی نے تمہیں مانگ چھوڑا ہے۔“

”مُمی! یہ حامی آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر بھری تھی۔ اب میں بالغ ہوں۔ عاقل ہوں! آخر میری مرضی بھی تو کوئی چیز ہے۔“

”دل! تم کچھ بھی نہیں جانتیں! یہ تمہارا جذباتی فیصلہ ہے۔ تم قطب صاحب کے ساتھ کبھی خوش نہ رہ سکو گی۔“

”کیوں مُمی؟“

”نادار نے ایک ہی تو وعدہ لیا تھا مجھ سے..... اس نے کہا تھا آپ قسم کھائیں کہ پری کی ہر خوشی پوری کریں گے۔ وہ جو بات اپنے منہ سے نکالے گی۔ آپ فوراً قبول کریں گے! اپنی ضد کے آگے میری بچی کو لائیں گے نہیں..... اور میں نے آنکھیں بند کر کے وعدہ کر لیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا! میری بیٹی ایک دن مجھے ہی تکلیف دینے والی بات کے لئے ضد کرے گی! ماں کے مرنے کے بعد اس نے اپنی پہلی خواہش کا اظہار کیا ہے اور تب سے میں ریزہ ریزہ ہو رہا ہوں۔“

”قطب صاحب! دلّٰ ویز نے حوصلہ کر کے کہا۔“ آپ کو کس بات کا خوف ہے؟ کیا اس بات کا کہ میں آپ سے آپ کی پرانی یادیں جھین لوں گی یا آپ کو بدل دینے کی کوشش کروں گی۔“

”جی..... آپ یہ دونوں باتیں کریں گی اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کریں گی..... اور اب میں کسی بات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

”اگر میں آپ سے وعدہ کروں کہ ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی! آپ کا سایا بن کے رہوں گی۔ تب.....“

”دلّٰ ویز آپ پری کا ساتھ دے کر مجھے اور بھی کرب میں مبتلا کر رہی ہیں.....“

”قطب صاحب میں آپ کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔“

”دلّٰ ویز! ایک بار پھر سوچ لیں! یہ کام بہت مشکل ہے..... میں تجبی، امان ہوں اور اگر

آپ سے کہوں میرے ساتھ رہتے ہوئے میرے بغیر رہیں اور مجھ سے ذرا سی بھی توقع نہ رکھیں..... اور.....“

”میں سب جان گئی ہوں مجھے پری سے محبت ہے۔ میں بھی تو پری کے لئے یہ سب کرنا

چاہتی ہوں۔ آپ تمہارا زندگی کاٹ سکتے ہیں۔ پری کے لئے یہ تمہاری زہر ہے۔“

گئے، چھپر کھٹ نہیں سایا جائے گا۔

بڑی کڑی منزیل نہیں، مگر وہ جتنی چلی گئی، وہ ایک الونی محبت پر یقین رکھتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ بچی محبت اور پر خلوص خدمت مرد کو بدل کے رکھ دیتی ہے۔ اپنے آپ پر..... اپنی جوانی پر برا بھروسہ تھا..... بڑی پراعتماد تھی۔

نکاح ہو چکا تھا، مہمان جا چکے تھے۔ وہ صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کوئی توقع نہ ہونے کے باوجود توقع کا ایک دم دم سادیپ گھونٹ کے آس پاس کہیں جل رہا تھا۔ اسے میں پری اپنا غرار استعجالتی ہوئی آئی اور اس کے پاس بیٹھ کر بولی:

”دل باجی... آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ اللہ..... اتنی خوبصورت لگ رہی ہیں کہ آپ کو دیکھیں گے تو شش کھا کے بے ہوش ہو جائیں گے۔“

دل ویز کو فنی آ گئی۔

”یہاں اسی طرح بیٹھی رہیں، میں ابی کو بلا کر لاتی ہوں۔“ وہ دوڑتی ہوئی گئی اور باہر سے قطب صاحب کو پکارتی، اس وقت قطب صاحب نے کریم کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سفید قبض اور سفید نائی کا ساتھ۔ پاؤں میں براؤن جوتے تھے۔ ایک دم سے تھکے ہوئے اور اجنبی لگ رہے تھے۔ پانپ ان کے ہاتھ میں تھا آتے ہی سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ دل ویز نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اسی انداز میں پانپ پی رہے تھے اور زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”دل باجی...“

”پری نے کہا:“

”آج آپ کہاں سوئیں گی۔“

دل ویز کا دل ایک دم دھڑکنے لگا اور اس نے اپنا سر اور بھی جھکا لیا۔ یہ بات سن کر

”ذرا اپنی اور ان کی عمر کا فرق دیکھو۔ تم ابھی تیس برس کی ہو اور وہ تو چھیالیس برس کے ہیں۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے، مجھے اس عمر کے مرد پسند ہیں، مجھے سنجیدہ اور بڑا مرد اچھے لگتے ہیں۔ اوجھے اوٹ چٹانگ اور اچھل کود والے مرد مجھے پسند نہیں۔“ مسز بیگ جان گئی تھیں کہ یہ صریح اشارہ تو حید کی جانب ہے۔

مگر پھر بھی وہ اسے بار بار منج کرتی رہیں۔ آخر دل ویز نے خود ہی تو حید کو خط لکھ دیا۔ نہ صرف خط لکھا بلکہ اس سے مدد چاہی بڑا رگوں کو ہوا کر کے لے۔

بہت دنوں بعد تو حید کا خط آیا اس نے لکھا:

”میں نے ایک خط اپنے ابو کو اور ایک خط چچی جان کو لکھ دیا ہے اب تمہاری راہ میں کوئی مشکل حائل نہیں ہوگی تمہاری دلی خوشی انشاء اللہ پوری ہوگی شاید تمہیں یاد نہ ہو دل... پہلے دن جب قطب صاحب تمہاری می سے ملے آئے تھے تو میں نے تم سے کیا کہا تھا... یاد کرو شاید یاد آ جائے جو کچھ تم نے کہا تھا اس کے جواب میں میں نے کہا تھا... میں تمہیں آخر وقت تک انتخاب بدلنے کا موقع دوں گا بزرگ ٹھیک کہتے ہیں کہ مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کہنی چاہئے جو انسان کی تقدیر بن جائے مگر میں نے تمہیں واقعی رائے بدلنے کا موقع دیا ہے کیونکہ تجھ کو بھلائی بار جب میں لاہور آیا تھا تم میں یہ تبدیلی میں نے محسوس کر لی تھی۔

بہر حال تمہاری سدا بہار خوشیوں کے لئے دعا گو ہوں۔“

پتہ نہیں تو حید نے تایا جی اور مسز بیگ کو کیا لکھا تھا کسی نے اسے خط نہیں دکھائے مگر ہر کام چپ چاپ خاموشی سے ہو گیا۔ البتہ قطب صاحب نے اسے باکر ایک دن کہا تھا..... وہ سرخ لہنگا سوٹ نہ پہننا بقاعدہ دہلی بن کر نہ آئے ہاتھوں کو مہندی نہ لگائے۔ نکاح میں زیادہ مہمان نہ بلائے جائیں۔ دعوت و ایسہ روایتی انداز کی نہیں ہوگی وہ باقاعدہ دلہا نہیں بنیں

ادھر ادھر دیکھا۔ لابی میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ قطب صاحب وہاں بیٹھے تھے۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس نے ایک مشکل ترین وادی میں قدم رکھ لیا ہے۔ آکر ستر پر بیٹھ گئی شاید قطب صاحب نے اس کی آہٹیں سن لی تھیں، وہ کمرے میں آگئے جانے کس وقت انہوں نے بھی کپڑے بدل لئے تھے سفید کرتے پا جاے میں ہمیشہ سے زیادہ اچھے لگ رہے تھے۔

آکر اس کے پاس کھڑے ہو گئے۔

”میں نے بہت سوچا میں آج کی رات تمہیں کیا تحفہ دوں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تحفہ دینا تو محبت کی علامت ہے اور آج رات میں جھوٹ یوں کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ غلط ہوگا لڑکیاں اس رات کے لئے بڑی جذباتی ہوتی ہیں، تم نے ہر قدم پر ثابت کیا ہے، تم مختلف لڑکی ہو۔ آج کی رات بھی تم سے یہی تھا ضرور کرتی ہے۔“

و لا یزچپ بیٹھی رہی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے:

”لوگ مرد کو انتہائی بے حس خود غرض اور ہرجائی قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔ میرے لئے آج

کی رات قبر میں کے آئی ہے۔ یادوں نے مجھ پر حملہ کر دیا ہے۔ میں اس حملے سے بچتا پھر رہا ہوں مگر غم نہ کا۔ مجھے معلوم ہے یہ سب باتیں تم سے کہنا درست نہیں اگر یہ نہیں کہوں گا تو پھر مجھے کوئی جھوٹ بولنا پڑے گا۔ جو میں بولنا نہیں چاہتا۔“

”پھر خاموشی چھا گئی۔“

انہوں نے پائپ..... منہ سے لگایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگے، و لا کو پہلی بار محسوس

ہوا کہ وہ پائپ سے حسد کرتی ہے۔ پائپ اس کے اور قطب صاحب کے درمیان ایک

دیوار..... لیکن اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ قطب صاحب کو بدلنے کی ہرگز کوشش نہ کرے گی۔

”میری بیوی کا نام یاد تھا.....“

قطب صاحب اٹھ کر پھر باہر چلے گئے۔

”دل ہاجی۔“ پری پھر بولی۔ ”آپ میرے ساتھ سوئیں گی یا ابی کے ساتھ۔“

”تم بتاؤ میں کہاں سوؤں۔“ و لا ویز نے سرگوشی میں پوچھا۔

”میری ای تو ہمیشہ ابی کے پاس سویا کرتی تھیں۔ مگر آپ میرے ساتھ سویا کریں ابی

ساری رات پڑھتے ہیں اور بور کرتے ہیں۔“

”بہت اچھا پری۔“ و لا ویز کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”میں کپڑے بدل کے تمہارے

کمرے میں آجاتی ہوں۔“

کپڑے بدل کے وہ پری کے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں کافی دیر تک خوب گپ لگاتی

رہیں پری آج بے انتہا خوش تھی اس کے اوپر بازو دکھ کے سو گئی۔ پھر اس کے خراؤں کی

آوازیں آنے لگیں۔ چپ چاپ رات اس کے سر ہانے آ کے کھڑی ہو گئی، پھر اس نے اپنے

آپ سے پوچھا۔

”میں کیا کروں۔؟“

ابھی تک اسے بلائے کوئی نہیں آیا تھا، اس نے اپنی ہر خواہش قطب صاحب کی خواہش

پر قربان کی تھی۔ اسے اپنی شادی پر خوب لال کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ اس کے گورے ہاتھوں

پر مہندی آگ لگا دیتی تھی۔ اس لئے اسے مہندی بہت پسند تھی۔ اس نے خوابوں میں اپنے

چھپر کھٹ کے سنے دیکھے تھے جس پر لڑیاں لٹک رہی تھیں، مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ کیا

وہ اپنی ہی رات بھی قطب صاحب پر قربان کر دے۔

”نہیں نہیں.....“ وہ بستر سے نکل آئی، اگر وہ بلائے نہیں آئے تو تجھے جانا چاہئے۔“

وہ اپنے کمرے میں آگئی سادہ سا کمرہ..... جس میں آج ایک بھی پھول نہیں تھا یہ اس

کی سہاگ رات تھی مگر چھپر کھٹ سوئی تاج کی طرح ویسے ہی بڑا تھا جیسے روز ہوتا..... اس نے

بڑی دیر کے بعد وہ اس طرح بولے جیسے کنوئیں میں سے بول رہے ہوں۔۔۔

”ہماری محبت کی داستان بڑی عجیب ہے۔ میں ماؤرا کے عشق میں اس وقت مبتلا ہوا تھا جب سولہ برس کا تھا ماؤرا میرے ہی محلے میں رہتی تھی۔ سولہ سال کے لڑکے کے عشق کو ہر کوئی کھیل سمجھتا ہے۔ مجھے اس بات پر غصہ آ کر آیا تھا ’جی!‘ کہ ماؤرا نے بھی کبھی میرے عشق پر اعتبار نہیں کیا۔ میں دس سال اس آگ میں سلگتا رہا اور وہ میری بیٹی اڑاتی رہی وہ مجھے طرح طرح سے آزما رہی تھی۔ مجھے نئی نئی آزمائشوں میں ڈالتی رہی۔ کئی بار اس کے والدین نے مجھے دھتکارا۔۔۔ مگر میں اپنی ہمت پر اڑا رہا۔ بالآخر میرے جذبے جیت گئے۔ دس سال کے بعد ماؤرا نے میرے ساتھ شادی کر لی۔ شادی کیوں نہ کرتی ’وقت اس کو محبت کے موڑ پر لے آیا تھا۔ اس وقت میری عمر چھپیس سال تھی‘ میں نے اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے اپنی خودی کا خون اتنی بار بہایا تھا اور بار بار اپنی انا اور خودی کو دوسروں کے ہاتھوں ذلیل کیا تھا کہ میرے اندر محبت کی بجائے صرف غصہ رہ گیا تھا۔ میں پر غصہ کسی پر نکالنا چاہتا تھا‘ مگر ماؤرا کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا نہیں تھا۔ شادی کے فوراً بعد میں ماؤرا کو اس کے والدین کے پاس چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا اور پورے دس سال میں نے ماؤرا کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ دس سال لوگ اسے مجھ سے متنفر کرتے رہے۔ میری بے وفائی کا یقین دلاتے رہے‘ مجھے چھوڑ دینے پر اکساتے رہے۔ مگر اس کا ایک ہی جواب تھا کہ ’ساری زندگی اس کے نام پر بیٹھی رہوں گی۔‘ جی!‘ کہ مر جاؤں گی۔“

وہ رک کر تھوڑی دیر پائپ پیتے رہے بے چینی سے پہلو بدلتے رہے۔ اور پھر ہمت کر کے بولے:

”میں انتہائی کمینہ آدمی ہوں میں نے پورے دس سال کا بدلہ ماؤرا سے لے لیا‘ حالانکہ یہ سب حالات کا قصور تھا‘ مگر میں نے بتایا؟ میں معاف نہیں کیا کرتا۔ میں اپنا حساب بے

باک کر لیتا ہوں۔ میں جس عورت کے قرب کے لئے ترستا تھا‘ میں نے اسے اپنے قرب کے لئے خوب ترسایا‘ خوب ترپایا اسے اچھی طرح آزما یا۔ اور جب مجھے اطلاع ملی کہ وہ ہر دم بیمار رہنے لگی ہے‘ میں اسے انگلینڈ لے گیا۔ سال بعد ہماری بیٹی پری پیدا ہوئی‘ پھر اس کے بعد ہم اس طرح رہے۔ جس طرح جسم میں جان رہتی ہے۔ اگر میں کبھی شرمسار ہو کر اپنے پچھلے رویے کی معافی مانگتا یا اپنے آپ کو برا بھلا کہتا تو وہ جھٹ کہتی:

”ایسا نہ کہو!‘ انہی دو یوں نے تو ہمیں قریب کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ہم اس طرح کبھی محبت نہ کر سکتے۔“

واقعی اسے محبت کرنے کا ڈھنگ آتا تھا‘ وہ اتنی صابر و شاکستہ‘ کہ کبھی شکایت نہیں کرتی تھی۔ آہ نہیں بھرتی تھی۔ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ میری ہر بات پر ایمان لاتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی پریشان ہوا کرتی اور کہتی:

قطب..... میں کتنی بے وقوف تھی دس سال تک تمہیں ترپاتی رہی۔ کاش ایک بار وہ زمانہ پلٹ آئے تو میں تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی پریشان نہ کروں۔“

اور کبھی کہتی:

”ہم لوگ کتنے پاگل ہیں‘ زیادہ تر وقت لڑائی جھگڑوں میں گنوا دیتے ہیں‘ حالانکہ یہاں محبت کرنے کو وقت بہت کم ہے۔ کاش ساری دنیا یہ جان لے۔۔۔ اور اپنا سارا وقت محبت کے ساتھ گزارے۔“

اور میں کہتا:

”ماؤرا اب ہم صرف محبت کریں گے۔ صرف محبت۔“

وہ کہتی: ”ٹھیک ہے۔“ وہ تو میری کسی بات کو غلط کہتی ہی تھی۔ اسے سب معلوم تھا اور مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ اس نے مجھ سے بدلہ نہیں لیا۔ مگر اپنے آپ سے لے لیا۔

تمہارے آگے اس لئے رکھ دی ہے کہ جب بھی تم چاہو پانیصلہ بدل لو۔۔۔ جب بھی چاہو
راہیں بدل لو۔

ہاں یہ رات ایسی کہانیاں کہنے کی نہیں تھی، لیکن آج کی رات میرے لئے بہت بھاری
ہے مرد کو محض ایک جانور نہیں سمجھنا چاہئے۔ مرد بھی انسان ہے۔ اس کے اندر بھی طوفان اٹھ
سکتے ہیں وہ جب تیز آنکھیں کی زد میں ہوتا ہے تو اس کے احساس کے سارے دیئے بجھ
جاتے ہیں جاؤ آج کی رات تم پری کے ساتھ جا کر سو جاؤ۔۔۔ میرے رویے سے دل
برداشت نہ ہونا جس دن کسی دوسری عورت کو ہاتھ لگانے کا حوصلہ ہو گیا۔ میں خود تمہارے
پاس آؤں گا۔“

☆.....

یہ اس کی شادی کی چوتھی رات تھی پری کو اچھی طرح سلا کر وہ ایک رسالہ لے کر بیٹھ گئی
تھی تین راتوں سے یہی ہو رہا تھا۔ اور مسز بیگ نے اس کے چہرے کے بجھے ہوئے چراغ
دیکھ کر اس سے سینکڑوں سوال بھی کر ڈالے تھے۔ اسی لئے تو وہ ہر وقت خوب میک اپ کئے
رہتی دن رات چمکیلے اور بھڑکیلے کپڑے پہنتی، جب قطب صاحب نے ہر بات کھول کر
سمجھا دی تھی۔ تو پھر منہ سے آہ نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔

”وِلا وِی۔۔۔“

قطب صاحب نے اسے پکارا۔ وہ چونک گئی، تین راتوں سے وہ اس آواز کی منتہی تھی۔
مگر آج جب یہ آواز آئی تو اسے اپنے ساعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”وِلا وِی۔“ انہوں نے دوبارہ پکارا تو وہ رسالہ ہاتھ میں پکڑے ان کے پاس آ گئی۔

”آؤ آج میرے پاس بیٹھو۔“

انہوں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ان کے چھونے سے اس کے اندر

جب مجھے ایک دن پتہ چلا کہ اسے کینسر ہو گیا ہے، میں چیخ اٹھا مگر وہ پرسکون رہی۔ بس
انتاہولی:

”جو بھی وقت رہ گیا ہے اسے ضائع مت کرو میرے پاس رہو تاکہ ہم محبت کرتے
ریں۔“

یہ چپ چپ سگنے والی عورتیں کہیں نہ کہیں روگ ضرور پال لیتی ہیں۔ ان کے اندر ناسور
بن جاتے ہیں اور ناسوروں پر اپنی مسکراہٹوں کے پھارے کستی رہتی ہیں۔ مجھے سب کچھ کرنا
تھا اور اسے جانا تھا، ٹھیک دس سال بعد وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اس نے جاتے وقت کوئی قسم
نہیں دی تھی۔ نہ کوئی وعدہ کیا تھا۔ کہا تو صرف اتنا۔۔۔

”اپنے آپ کو خوش رکھنا قطب زندگی بار نہیں ملتی، تم مرد ہو۔ دنیا کو تمہاری ضرورت
ہے پھر سے پھر پور زندگی گزارنے کی کوشش کرنا۔“

میں کہنا چاہتا تھا:

”نہیں۔۔۔ تمہارے بعد نہیں۔۔۔ تمہارے بعد نہیں۔۔۔ تمہارے بعد کوئی
نہیں۔۔۔ نہ دل میں نہ گھر میں۔ میں نے اسے صرف دس سال کی سزا دی تھی۔ وہ مجھے عمر
بھر کی سزا دے گئی۔

وِلا وِی۔۔۔ تم ابھی بہت معصوم ہو نہیں جانتی ہو۔۔۔ غم کے ساتھ جب بچھتاؤں کی
سلاخیں دل میں تب جاتی ہیں تو انسان کیا بن جاتا ہے یہ سلاخیں میرے سینے میں گڑی
رہیں گی ان سلاخوں کو نکالنے کی کوشش کبھی نہ کرنا میں ایک ایسا رمل سا آدمی ہوں محبت کا چلن
تو مجھے تب بھی نہ آیا تھا۔ مگر میں کوشش کروں گا دنیا کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ڈال
دوں۔۔۔

میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں تمہارا شکر گزار ہوں۔ میں نے اپنی صحیح تصویر

سارے مجھے ہوئے الاؤ بھڑکنے لگے۔

جلدی سے بولی: میں پری کے کمرے کی بتی بجھا آؤں۔“

اور کہکشاں پر چلتی گئی..... اس کی بتی بجھائی..... پلنگ کے قریب آئی تو قطب صاحب بولے:

”پلیز! اپنے کمرے کی بتی بھی بجھاؤ۔ دلاؤ ویزے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ تو وہ ذرا سا پرے کھسک گئے۔ اور بولے:

”تم یہاں آؤ۔“

وہ ایک معمول کی طرح بتی بجھا کر آگئی۔

تھوڑی دیر بعد اس کے دل نے اس سے پوچھا۔ کیا تو فی ٹیلی فون ہے، لیکن ہے کیا تجھے چھپر کھٹ پر لانے سے پہلے تیرے ناز اٹھائے جا رہے ہیں.....

اسے بہت متناہی قطب صاحب کو چھو کر محسوس کرنے کی..... ان کے ہاتھوں کو..... ان کی آنکھوں کو..... ان کے ہونٹوں کو..... اور قطب صاحب کے دل کی دھک دھک سننے کو دل چاہتا تھا اور ان کے کپڑوں کی مہک میں ڈوب جانے کی تمنائی اور ان کے ہاتھوں میں بکھر بکھر جانے کی خواہش تھی۔ قطب صاحب کو اس نے چھو کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

ان کے گریبان کی خوشبو سے اپنے ہتھنوں کا غسل بھی نہیں کیا تھا۔

سرگوشیوں میں درد دل بھی نہیں کہا تھا۔ جسم کا رواں رواں گوش براؤاز رہا..... اور فرض

ادا ہو بھی گیا.....؟

تب کروٹ دوسری طرف بدل کے اس نے سوچا فرض اور محبت میں کیا فرق ہے.....

اور یہ دونوں اکثر ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ ایک عجیب سا احساس زیاں ہو رہا تھا۔ جیسے مدت سے کوئی پونجی سنبھال کر رکھی ہو۔ اور آج غلط موقع پر لٹ گئی ہو.....

صبح ناشتے کی میز پر جب وہ اپنے گیلے بالوں سمٹ آگئی تو پری نے اسے ٹوکا:

”دل باجی! صبح صبح نہ نہایا کریں۔ میری امی صبح نہایا کرتی تھیں پھر ان کے سر میں

درد رہنے لگا تھا۔“

دلاؤ ویزے نے گھبرا کر قطب صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے ناشتہ کر رہے

تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ان کو تو احساس بھی نہیں تھا۔ کالج کا ایک قیمتی

گلدان نوٹ گیا ہے۔ اجالوں بھری جوانی آج اندھیری ہوگئی ہے اور خوابوں کے سارے

فانوس ایک دم بجھ گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے کب کہا تھا۔

کہ میں خوابوں کی حفاظت کروں گا۔ خواب تو سارے دلاؤ ویزے نے دیکھے تھے۔ کوئی

بات نہیں..... دلاؤ ویزے نے اپنے گیلے بالوں کے ٹپ ٹپ کرتے آنسو پونچھے وادی عشق ایک

خارزار ہے قربانی کی صلیب وزنی ہوتی ہے..... مگر ہولے ہولے..... رفتہ رفتہ..... زندگی کا

چلن بن ہی جائے گا۔

☆.....

”قطب صاحب!“ دلاؤ ویزے مسکراتی ہوئی آئی اور آ کر ان کے قریب کھڑی ہوگئی۔ منہ

سے پائپ بنا کر انہوں نے دلاؤ ویزے کو دیکھا تو وہ اسی انداز میں بولی:

”میری کچھ سہلیاں آپ سے ملنا چاہتی ہیں؟“

”مجھ سے۔“ انہوں نے مزید حیرت سے کہا۔ ”ان کا دماغ خراب ہے۔“ دلاؤ ویزے

پپ چاپ کھڑی رہی..... ”بھئی! آپ انہیں سمجھائی کیوں نہیں کہ میں کوئی ملنے یاد رکھنے کی

چیز تو ہوں نہیں۔ یونہی بدتمیز سا آدمی ہوں۔“

”سب کی سب اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں۔“ دلاؤ ویزے نے ان کی ہر بات سنی ان

سنی کر کے کہا:

”کئی دنوں سے تقاضا کر رہی تھیں۔ آج آگئی ہیں۔“

”کیا کریں گی مجھ سے مل کر.....؟“

”وہ میرے شوہر سے ملنا چاہتی ہیں۔ ایک شادی شدہ آدمی سے ملنے کا اور کیا مقصد ہوتا ہے۔“ دلا ویز رو ہانسی ہو گئی۔

”میں کون سا پورا شوہر ہوں۔ اور پھر شادی شدہ تو تم ہو۔ میں ان خواتین سے ملنے کے آداب نہیں جانتا۔ خواہ مخواہ ملنے کے بعد تمہارا دل بھی برا کریں گی.....“

دلا ویز نے پلکوں پر آئے آنسوؤں کے اور کچن کی طرف نکل گئی۔ اور میرا دل کیا برا ہوگا قطب صاحب! آپ کبھی میرے شوہر نہ بن سکے اور میں یوں بننے سے تھک گئی۔

ہر روز ایسی کوئی بات ہو جاتی تھی۔ ہر روز اس کے دل کے آئینے پر ایک بال آ جاتا تھا اور جب وہ دل کے آئینے پر آنسو گراتی تو آئینہ اس کی ہنسی اڑاتا۔ محبت کی قربان گاہ پر تو خود بھیئت چڑھی تھی، تجھے کس نے مجبور کیا تھا۔

کس نے مجبور کیا تھا..... یہ دل ہی اوندھ منہ گر گیا تھا۔ مگر شادی کے بعد اسے پتہ چلا کہ وہ بھی ایک عام سی لڑکی ہے۔ ویسے ہی خوب دیکھتی ہے۔ جیسے اس عمر میں لڑکیاں دیکھتی ہیں۔ اس خیالی جنت کو اپنے گھر میں بسانا چاہتی ہے، یہ ضرور ہے کہ اس نے قطب صاحب کے ماضی کو گوارا کر لیا تھا۔ ان کی کج ادائیگوں کے ساتھ نہیں سینے سے لگا لیا تھا، مگر وہ سینے سے کب لگے تھے۔ ان دونوں کے سینوں کے درمیان ایک گہری کھائی تھی۔ ایک دل ادھر دھڑکتا رہتا اور دوسرا ادھر..... کبھی یک جانی کا احساس نہ ہوا اور وصل کا لمحہ بیت گیا۔

مزمزبگ نے کہا تھا:

”دلا ویز! کبھی اگر تم میرے پاس روتی ہوئی آئیں تو میں اسی روز مرنے جاؤں گی.....“

اس لئے دلا ویز رو بھی نہیں سکتی تھی۔ منہ بھیج کر کانٹوں پر چل پڑتی تھی۔ آج نہیں تو

کل..... پھر انجانے میں اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ قطب صاحب کو کبھی بدلنے کی کوشش نہیں کرے گی۔

ایک دن اس نے کمرے کی ترتیب بدل دی، کمرے میں نئی چیزیں لا کے رکھیں۔ گلدان میں پھول سجادیے۔ سفید پردے اتار کر سرخ پردے لٹکا دیے۔

شام کو قطب صاحب کمرے میں آئے۔ تو ان کے تہہ گڑے پھر وہ پاپ اٹھا کے ابلی میں جا بیٹھے..... ڈرتے ڈرتے دلا ویز ان کے پاس گئی تو بولے:

”پلیز دلا ویز! مجھے سرخ رنگ سے وحشت ہوتی ہے۔ میں نے اپنا کمرہ اپنی مرضی سے سادہ اور سفید رکھا ہوا تھا۔ مجھے رنگوں کے درمیان فیضان نہیں آتی۔ آپ مہربانی کر کے میرے کمرے کو پہلے جیسا کر دیں! اگر آپ کو میرے کمرے کی ترتیب پسند نہیں ہے تو اپنے گیسٹ روم کو اپنا کمرہ بنالیں! مجھے معلوم ہے آپ اپنا کمرہ اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق بنانا چاہتی ہیں اور آپ کو اپنی مرضی کے مطابق رہنے کا حق بھی ہے۔“

پری کو ساتھ مل کر دلا ویز نے اسی وقت ہر شے وہاں سے اٹھائی اور ان کا کمرہ پہلے جیسا کر دیا..... ویسے بھی..... ایک رات کے علاوہ..... نیند کی زیادہ راتیں دلا ویز پری کے کمرے میں گزارتی تھی۔ اس لئے اس نے گیسٹ روم کو اپنا کمرہ بنالیا۔

اگلے روز قطب صاحب نے اس کے کمرے کے لئے الگ ٹی وی، ایک خوب صورت ڈونی اور ڈیکوریشن کی کچھ چیزیں بھیج دیں۔ پری نے دلا ویز کے ساتھ مل کر کمرہ سجایا۔ ہر شے سرخ اور سنہری لگ رہی تھی۔

پری بولی:

دل باجی اب لگ رہا ہے اس گھر میں دلہن آئی ہے۔“

دلا ویز کے دل میں کہیں سوئی چھب گئی۔ دلہن وہ اپنی مرضی سے بنی تھی۔ اس لئے تو

جائیں۔“

تب اس نے میز پر چائے گلوادی۔

رات کے دس بجے جب قطب صاحب آئے تو اس نے بڑی نرمی سے شکوہ کیا۔
”میں چھ بجے تک آپ کا انتظار کرتی رہی کیا آپ بھول گئے تھے کہ آج میں نے سکول ٹیچر کو مدعو کیا تھا۔“

”نہیں بھولا تو نہیں تھا مجھے اچھی طرح یاد تھا۔“

”پھر آپ آئے کیوں نہیں مجھے بہت شرمندگی اٹھانا پڑی۔“

”مجھے افسوس ہے۔ تمہیں کوفت ہوئی، مگر اس کوفت کو اب عادت ہی بنا لو۔۔۔۔۔“

”کیوں جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“

”مجھے لوگوں سے ملنے کا شوق نہیں ہے۔“ قطب صاحب بولے۔

”وہ لوگ تو نہیں تھے۔۔۔۔۔“

”ہاں میں جانتا ہوں، مگر تم ایک کرم کرو مجھ سے نہ ہی باؤ تو اچھا ہے۔“

”مگر کیوں۔۔۔۔۔“ اس کا لہجہ ذرا تیز ہو گیا۔

قطب صاحب نے فحاشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا:

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے بدلے کی کوشش نہیں کرو گی۔“

”تو۔۔۔ تو۔۔۔“

باہر آ کر دلاؤ ویزر پڑی۔ ”مجھے کیا معلوم تھا آپ بد اخلاقی بھی کرتے ہیں۔ گھر آئے

نوں ملنا تو بد اخلاقی ہے۔“

”دلاؤ ویزر شاید وہ لوگوں کو یہ نہیں بتانا چاہتے کہ وہ تمہارے شوہر ہیں۔ شوہر تو ان کو

زبردستی تم نے بنایا ہے۔ انہوں نے تمہیں اپنی بیوی تسلیم نہیں کیا۔“ اس کے دل سے آواز

اسے ایک بھی سہاگ رات اپنی مرضی سے نہ نصیب ہوئی تھی۔ قطب صاحب کا وہی رویہ تھا جو ہمیشہ نظر آیا کرتا تھا۔ جواب بات بات میں دلاؤ ویزر کو تکلیف دیتا تھا۔

ایک بار پہلے بھی ایسا ہوا تھا شادی کے بعد دلاؤ ویزر نے سکول کی استانیوں کو چائے پر بلایا تھا اور بطور خاص قطب صاحب سے کہا تھا وہ شام کو چار بجے ضرور آ جائیں دلاؤ ویزر کو یقین بھی تھا کہ وہ آ جائیں گے، مگر پوری شام گزر گئی۔ وہ نہیں آئے۔ ساری ٹیچرز نے اس کا خوب مذاق اڑایا، کیونکہ چھ بجے تک اس نے میز پر چائے نہیں رکھی۔

ایک بولی:

”یہ بڑھے شوہر خوب ناز اٹھواتے ہیں، کیسی تڑپ رہی ہے تو۔۔۔۔۔ اور اسے غالباً یاد ہی

نہیں۔“

دوسری نے کہا:

”تو نے تو اس لئے بڑھے آدمی سے شادی کی تھی نا؟ کہ تجھے محبت کے ساتھ شفقت

دے گا اور تو خوب خوب نخرے کرے گی، مگر ایک بات یاد رکھنا بڑھے شوہر تنگی مزاج اور

چڑچڑے ہوتے ہیں۔ اگر بیوی جوان ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت بھی ہو تو ذرا

فاصلے پر رہتے ہیں کہ سر پر نہ چڑھ جائے اور گھر میں اس کی سہیلیاں بھی آ جائیں تو حسد

کرنے لگتے ہیں۔“

”نہیں قطب صاحب ایسے نہیں ہیں۔“

اس نے بڑے سکون سے کہا تھا۔ ”میں ضرور کوئی اہم کام پڑ گیا ہوگا۔“

”ہاں ابھی شادی کو ایک مہینہ ہوا ہے اور تمہاری باتیں بھولنے لگے ہیں۔“

”کاروباری آدمی کے ساتھ ایسی مجبوری ہوتی ہے۔“

”بھئی ہمارے ساتھ تو ایسی کوئی مجبوری نہیں، ہمیں تو چائے پلاؤ۔ ورنہ ایسے ہی چلے

تمہارا شکر گزار ہوں، کہ تم نے کبھی میری زندگی میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کی۔ جواب کے طور پر میں بھی ایسا ہی کروں گا۔“

دلّہ ویز کا دل چاہتا ہیچے چلائے اور رو کر کہے۔ قطب صاحب..... خدا کے لئے میری زندگی میں دخل دیجئے۔ مجھے بات بات میں نوکے۔ مجھے ڈائیئے۔ ضد کر کے مجھ سے اپنا آپ منوائے۔ مجھے تو زچھوڑ دیجئے۔ میں تیشے کے گھر میں رہتے رہتے تھک گئی ہوں۔

مگر دلّہ ویز نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اپنے کمرے میں جا کر تھوڑے سے آنسو بہائے اور اگلے دن سے سکول جانا شروع کر دیا۔

مئی نے اس کا اتر ہوا چہرہ دیکھا تو بس اتنا پوچھا:

”دل! تم ابھی کچھ دیر گھر پر آرام کرتی تھی۔“

”نہیں مئی..... وہ نظریں جھکا کر بولی۔ گھر پر تو کوئی کام نہیں ہے۔ میں تین مہینے گھر

میں بیٹھ کے تھک گئی ہوں۔ دراصل لیچپن سے کام کرنے کی عادت ہے نا؟ اور پھر آپ جانتی ہیں۔ یہ سکول تو مجھ سے چھٹ ہی نہیں سکتا۔“

”تمہارے تایا جی بہت یار ہیں بیٹا۔ کسی دن ان کو جا کے پوچھ آنا۔“

انہوں نے بات بدل دی ”اور قطب صاحب کو بھی ساتھ لے جانا.....“

”اچھا مئی.....“

شام کو وہ تیار ہو کر آئی اور قطب صاحب سے بولی:

”تایا جی بہت بیمار ہیں۔ میں انہیں دیکھنے جا رہی ہوں۔“

”ضرور جاؤ۔“

قطب صاحب نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔“

آئی۔

تو وہ چپ چاپ جا کر اپنے کمرے میں بیٹھ گئی، ہر روز ایک کڑی منزل سامنے تھی، ایک روز پری نے اور دلّہ ویز نے پچکر کا پروگرام بنایا۔ دلّہ ویز نے پری کو کھایا کہ جا کر اپنی سے کہو..... وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔

مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا، کہنے لگے۔ ”بھئی اب میری عمر نہیں ہے پچکر وغیرہ دیکھنے کی نہ مجھے دلچسپی ہے، تم اور دلّہ ویز چلی جاؤ۔“

بازار جانا ہو تو وہ پری کے ساتھ جائے، پچکر دیکھنا ہو تو پری کو ساتھ لے جائے، کسی عزیز کے گھر جانا ہو تو ڈرائیور کو لے جائے، کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا تھا..... کہ قطب صاحب اس کو بیوی کے طور پر لے کر گھر سے نکلیں..... اپنے آپ کو سوچوں سے بچانے کے لئے اس نے دوبارہ سکول جانا شروع کر دیا تھا۔ کم از کم دو پہر تک تو مصروف ہی رہتی تھی۔

سکول دوبارہ جوائن کرنے سے پہلے بھی اس نے قطب صاحب سے پوچھنا مناسب سمجھا، کیونکہ اس نے سن رکھا تھا۔ جو مرد صاحب حیثیت ہوں۔ وہ اپنی بیویوں کا جاب کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے بولی:

”قطب صاحب! میں دوبارہ مئی کے سکول میں پڑھانا شروع کر دوں۔“

”اگر تم مناسب سمجھتی ہو تو ضرور شروع کر دو۔“

”مگر آپ کا کیا مشورہ ہے؟“

”تم اپنی زندگی کی خود مالک ہو سمجھ دار ہو۔“

”لیکن اگر میں آپ کو اپنی زندگی کا مالک سمجھوں تو؟“

”یہ تمہاری مہربانی ہے مگر میں جانتا ہوں، کوئی کسی کی زندگی کا مالک نہیں ہوتا۔ میں اپنا کوئی کام کرنے سے پہلے تم سے مشورہ نہیں لیتا۔ نہ تمہارے مشورے پر چلنا پسند کرتا ہوں۔“

کیا۔ اور جب اس نے قطب صاحب کو بتایا تو بولے:
”اتنا شور اُٹا کر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید یہ عورتیں گھروں میں سکون کے ساتھ
نہیں رہ سکتیں۔“

سالگرہ سے ایک دن پہلے وہ پنڈی چلے گئے۔ جاتے جاتے پری کو تھک دیتے گئے۔
سالگرہ والے دن دلاؤ کا موڈ بہت خراب تھا، دل بھجا بھجا تھا اور بات بات پر غصہ
آ رہا تھا۔ مگر مسکرا مسکرا کر مہمانوں کا سواگت کر رہی تھی۔ اور بس بس کر اپنے آنسو پی رہی
تھی۔

”ارے بیٹی کی سالگرہ ہے اور باپ پنڈی چلا گیا۔“

”ایک ضروری کام پڑ گیا تھا۔“

”ایسا بھی کیا ضروری کام تھا؟“

وہ لوگوں کو جواب دے دے کر تھک گئی تھی، قطب صاحب کی ایک سزن بھی آئی ہوئی
تھی۔ وہ لوگوں کو واضح الفاظ میں بتا رہی تھی کہ قطب کی پہلی بیوی اتنی خوب صورت تھی
جیسے تصویر ہوتی ہے۔ قطب کو اس سے عشق تھا۔ اس بچارے نے تو کبھی شادی نہ کرنے کی
قسم کھائی تھی۔ مگر اب اپنی لڑکی کے ہاتھوں مجبور ہو گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر ناک
چڑھا کر کہتی۔ وہ اب کبھی ایسی محفلوں میں شامل نہیں ہوگا۔ اسے تو خوشی کی محفلوں سے
دشمت ہوتی ہے۔“

اس کی باتیں سن کر دلاؤ و اندر ہی اندر پانی پانی ہو رہی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تو اس
عورت کو ہرگز نہ بلاتی۔ اس محفل میں بھی آئی ہوئی تھیں۔ مگر اس کے گھر نہیں آیا کرتی
تھیں وہ خود ہی دروازہ شام کو می سے مل آتی تھی۔ اگر کبھی کبھار کوئی ملنے آ جاتا۔ یا کوئی پیغام
دینا ہوتا تو وہ کھڑے کھڑے آئیں اور واپس چلی جاتیں۔

”میں..... کیوں.....؟“

”آپ میرے شوہر ہیں ملنے جائیں گے تو وہ بہت خوش ہوں گے۔“

”بزرگوں سے ملنے کے آداب میں تو جانتائیں ہوں۔ بہتر ہے مجھے معاف کر دو۔“

”بس پانچ منٹ کے لئے جائیں گے آپ چپ بیٹھے رہیں۔ میں ہی بات کروں گی“

پھر آ جائیں گے۔“

”بھئی تم مجھے ڈی بنا کر لے جاؤ ہی کیوں؟ میں اپنی مرضی کے خلاف کہیں نہیں جایا
کرتا۔“ ان کے لہجے میں خشکی تھی۔ دلاؤ ویز پاؤں بچتی باہر آ گئی۔ انہوں نے پروا نہیں کی.....
وہ خود ہی گئی اور تابی کو پوچھ کر آ گئی وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ قطب صاحب
کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے، مگر دلاؤ ویز اپنے آنسو روک کر دھیمے
دھیمے لہجے میں بتاتی رہی..... کہ

”وہ بہت اچھے ہیں۔ نفیس آدمی ہیں۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتے ہیں۔ آج

انہوں نے میرے ساتھ آنا تھا۔ مگر اچانک ایک میننگ پر جانا پڑ گیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ شفقت سے بولے۔

دلاؤ ویز کا دل چاہا..... وہ وحید کے بارے میں پوچھے کہ وہ آج کل کہاں ہے؟ مگر اندر
سے کوئی شے روکتی تھی۔ بات زبان پر آ کر رک جاتی تھی۔ تو وحید تو اس کی شادی پر بھی نہیں آیا
تھا..... بس مبارک باد کا ایک کارڈ بھیج دیا تھا۔

انہی دنوں پری کی سالگرہ آ گئی۔

دلاؤ ویز اور پری نے مل کر سالگرہ کا خوب اہتمام کیا۔ گھر کو پھولوں اور جھنڈیوں سے سجا
دیا دلاؤ ویز کی شادی کے بعد چونکہ یہ پہلی سالگرہ آ رہی تھی اس لئے دلاؤ ویز نے اپنے سب
ملنے چلنے والوں کو بلوایا، قطب صاحب کے جو رشتہ دار لاہور میں رہتے تھے۔ ان کو بھی مدعو

بولی:

”دیکھنا تو کہیں تمہارا شوہرا احتیاط تو نہیں کر رہا؟ تم تو ابھی معصوم ہو چھوٹی سی ہو۔ ان باتوں کو کیا جانو..... ممکن ہے وہ تم سے بچ نہ چاہتا ہو۔“

تب سے اس کے دل کو تحس کا دھبہ لگ گیا تھا! بالآخر اس نے اس بات کا کھوج لگا لیا۔ اور قطب صاحب نے تصدیق بھی کر دی۔ کئی دن تک سوچوں نے اسے شل رکھا! اب اسے یوں لگتا جیسے اس کی ماما کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ اس کو زمین میں زندہ گاڑا جا رہا ہے۔ اسے زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جا رہا۔ بہت سارو چکنے کے بعد..... بہت دن سوچنے کے بعد..... اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ قطب صاحب سے بات کرے گی۔ ان سے اس معاملے میں ضرور رائے ملے گی، وہ کون ہوتے ہیں۔ ایک طرز فیصلہ کرنے والے.....

کتنے دنوں کے بعد یہ رات آئی تھی، جب انہوں نے اسے خود اپنے کمرے میں بلالیا تھا! ایسی مہربانی وہ کبھی کبھار ہی کرتے تھے، مگر اس نے بھی آج جان پر کھیل جانے کا سوچ رکھا تھا۔ اتنی بڑی بات کہنے کے بعد وہ قطب صاحب کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی! اس لئے گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھی تھی۔ بہت دیر کے بعد قطب صاحب بولے:

”تمہیں یاد ہوگا، تم نے کہا تھا تم مجھے بدلے کی کوشش نہیں کرو گی۔ نہ مجھ سے کچھ چھیننا چاہو گی۔“

”جی یاد ہے۔“ دلاؤ دیز نے سر اٹھا کر کہا۔ ”دن میں ایک بار اپنے رویے سے آپ مجھے یہ سب یاد دلا دیتے ہیں۔ بار بار کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ تو آپ کو بدلے کی کوشش کر رہی ہوں! نہ کچھ چھین رہی ہوں! ایک چیز مانگ رہی ہوں وہ بھی ایسی چیز جس پر قدرتی حق بنتا ہے۔ اللہ نے انسانوں کو جو حق دیے ہیں وہ بندے نہیں چھین سکتے۔“

”لیکن مجھے بچ کی ضرورت نہیں ہے۔“

کرب..... کچھ تھا جس کے ارد گرد پائپ کا دھواں پھیل گیا۔ اس کا دل چاہا ہاتھ مار کے اس دھواں کو بٹا دے۔ کہ وہ بولے:

”میں اتنا ذہین نہیں ہوں کہ تمہارے اشارے سمجھ سکوں! ذرا صاف کہو کیا بات ہے؟“

”قطب صاحب!“ دلاؤ دیز کے لہجے میں کڑوا پن تھا۔ ”آپ ذہین سے بھی کچھ زیادہ ہیں، مگر میں آپ سے صاف صاف ہی کہوں گی! اگر ڈھنائی کر لی ہے، ٹھیک مانگنے کی تو پھر شرمنا کیسا؟ یہ تو ٹھیک ہے کہ میرا آپ کا معاہدہ ہوا ہے شادی نہیں ہوئی! آپ کی ایک بیٹی ہے اور آپ کو اس کی خوشیاں عزیز ہیں! مجھے بھی اس کی خوشیاں عزیز ہیں! مگر میں ایک عورت ہوں۔ ہاں ماما پر میرا بھی حق ہے اگر آپ کچھ اور نہیں دے سکتے تو ایک بچہ مجھے ضرور دیجئے۔“ یہ کہہ کر دلاؤ دیز نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ دیا، جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ یہ ساری احتیاط ایک طرف ہے تو وہ کیسی اذیت میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس بات کا احساس بھی سارے ملے جلنے والوں نے دلا تھا! جو شادی کے ایک سال بعد ہی فرض سمجھ کر ایسے سوالات پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔

”کیوں بھی کیا بات ہے آج کل سست لگ رہی ہو۔“

”اچھا کوئی بات نہیں۔“

”کیوں نہیں بھی؟“

”شادی کو ایک سال ہو گیا۔“

”ایک سال ہو گیا۔“ وہ دل میں سوچتی..... اسے تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے شادی کو ایک صدی ہو گئی ہو۔ اور وہ اب بوڑھی ضعیف ہو گئی ہے۔ تہنذاؤں کو نوچ پھینکو تو انسان بوڑھا ضعیف ہو جاتا ہے۔

مگر بھلا ہوا اس کی ایک سنہیراستانی کا..... بہت سے نکلنے کی باتیں پوچھ کر ایک دن

فیرتی کو گوارا نہ کیا اور بستر سے اتر آئی جو تے پہنے اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

اے معلوم تھا قطب صاحب کبھی اسے منانے نہیں آئیں گے۔ وہ قطب صاحب کی ضرورت نہیں تھی قطب صاحب اس کی ضرورت تھے۔ مرہ کو جب اس بات کا احساس ہو جائے تو عورت کی انا کو کھل کے رکھ دیتا ہے۔ اس نے جی بھجائی۔ اور اپنے تکیے سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی جب اچھی طرح دل کی ہلڑ اس نکال چکی تو ایک دم اسے خیال آیا اے ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ اس نے واقعی قطب صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گی۔ آج اس نے قطب صاحب کے ساتھ سخت کلامی کی تھی اور انہیں ان کی مرضی کے خلاف مجبور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے اپنا عہد نبھانا چاہئے تھا۔ انہیں کچھ بھی نہ کہنا چاہئے تھا۔ اس کا دل چاہا۔ وہ اٹھ کر جائے اور قطب صاحب سے معافی مانگ لے۔ اس نے کلامی پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اب بہت دیر ہو گئی تھی غالباً وہ سو چکے ہوں گے اور کیا خبر جگانے کے بعد وہ گلز جائیں۔ کتنے انتظار کے بعد ایک رات نصیب ہوئی تھی۔ اور اپنے جذباتی پن سے اس نے وہ رات بھی گنوا دی شاید اس کے بعد قطب صاحب اسے کبھی بلائیں ہی نہیں۔۔۔۔۔

سوچتی۔۔۔۔۔ جلتی۔۔۔۔۔ کڑھتی وہ سو گئی، صبح تھک دیر سے آنکھ کھلی شکر ہے جھنی کا دن تھا۔ ورنہ سارے گھر میں ہلچل مچ جائے، وہ اٹھ کر لابی میں آ گئی۔ نوکر نے قطب صاحب کو جانے دے دی تھی، کیونکہ ان کے کمرے سے ہلکا سا دھواں۔۔۔۔۔ اور دھبی دھبی خوشبو آ رہی تھی۔ وہی خوشبو جسے سونگھ کر کبھی وہ بے تاب ہو جایا کرتی تھی۔ اور اس کا دل چاہا کرتا تھا اپنے تن کے ٹکڑے بنا کر قطب صاحب کے تلے بچھا دے۔۔۔۔۔

بہت مشکل ہے یہ ٹکڑے بچھانے کا عمل۔۔۔۔۔ اسے دل میں سوچا انا کی ندی پار کرنا جان جو بھم کام ہے۔

قطب صاحب رکھائی سے بولے۔

”میں جانتی ہوں آپ کو تو یہی کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر جس طرح آپ نے کڑوے گھونٹ کی طرح مجھے گوارا کر لیا ہے۔ اس طرح بچے کو بھی گوارا کر لیں۔“

”میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ میں اپنی بیٹی کے لئے۔۔۔۔۔ اور کچھ بھی نہیں کروں گا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ مجھ پر یقین نہیں رکھتے، آپ مجھے سو تیلی ماں سمجھتے ہیں آپ کا خیال ہے۔ میرا بچہ ہو گیا تو میں پری کے ساتھ بے پروائی کروں گی، ظلم کروں گی اسے اپنے سے دور کر دوں گی، روایتی سو تیلی ماں بن جاؤں گی ہے نا؟“

یہ کہہ کر دلا ویز رونے لگی۔

قطب صاحب خاموش ہو گئے انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، بس چپ چاپ چھت کو دیکھتے رہے اور پائپ پیٹے رہے۔ پھر کافی دیر کے بعد بولے:

”رورور مجھے کیوں پریشان کرتی ہو دلا ویز۔۔۔۔۔ دنیا میں ہر بات کا امکان ہے میں نے تم سے کہا تھا۔۔۔۔۔ میں ایک خالی مکان ہوں مجھے تو مزید بچوں کی آرزو ہی نہیں میں گھر میں کوئی ہلچل برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے پاس رونے دھونے کا وقت نہیں ہے۔ اب ہماری بیٹی ماشاء اللہ گیارہ سال کی ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں کسی بچے کو قبول کر سکے گی یا نہیں۔“

دلا ویز بیٹھی انگلیوں سے اپنے آنسو اڑاتی رہی۔

پھر قطب صاحب ایک دم اس کی طرف دیکھ کر بولے:

”اب یہ بات مجھے پری سے نہ کہلوادیتا۔ تمہیں ایک راستہ مل گیا ہے بات منوانے کا۔۔۔۔۔“

دلا ویز کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں ہرجمعی مار دی ہے۔ اس سے زیادہ بے

بس پری کا اتنا کہنا تھا کہ دلا ویز کی سوچی سوچی آنکھیں اور سرخ ہو گئیں۔ اور پھر ان میں سے بے شمار قطرے بھر آئے۔

”اللہ آپ اب بھی رو رہی ہیں‘ کیا ہوا ہے آپ کو.....؟“ پری کھڑی ہو گئی اور اپنا فزاک بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے لگی ”کہیں اپنی تو کچھ نہیں کہا۔“ دلا ویز نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ پھر گود میں بٹھا کر بولی۔

مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا پری بس رات سے میری طبیعت خراب ہے.....“

”آئی بیگ کو بلا لاؤں؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”نہیں می کو بتانا بھی نہیں۔ تمہیں پتہ ہے نا وہ بیمار بنتی ہیں اس طرح وہ پریشان ہوں گی۔“

پری نے اپنے موٹے موٹے ہاتھوں سے دلا ویز کے لڑھکتے ہوئے آنسو صاف کرنے شروع کر دیئے اس کے ہاتھ کالمس محسوس کر کے دلا ویز کے دل میں مامتا کا ایک تیز دھارا بہنا..... دونوں بازو پھیل کر اس نے پری کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ پری کا سر ان کے نتھوں کے قریب آ گیا۔ خوب صورت سنہری بالوں میں سے ایک بے پردائی آسمانی خوشبو آ رہی تھی۔ پری کے سارے جسم میں ایک مقدس مہک تھی۔ ایسی مہک جو فرشتوں سے آئی ہے۔ پری کو پورے وجود کے گرد مامتا کو جگانے والی ایک الوہی خوشبو کا ہالہ تھا۔ اس خوشبو نے دلا ویز کی ساری محرومیوں کو جگا دیا..... اس نے بے تاب ہو کر پری کے رخساروں پر اپنا رخسار رکھ دیا اور بے اختیار روناشروع کر دیا۔ پری کے دونوں رخساروں آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ پتہ نہیں چل رہا تھا پری رو رہی ہے یا دلا ویز بلکہ کبھی کبھی کوئی نمکین آنسو پری کے جیزوں میں چلا جاتا..... تو وہ زبان سے اسے باہر نکالنے کی کوشش کرتی..... پری سخت حیران تھی کہ دل باجی کو کیا ہو گیا ہے..... لیکن دلا ویز کا درد کوئی سننے والا نہیں تھا۔ اس لئے وہ

اس کا دل جاپا وہ قطب صاحب کے پاس جائے اور رات کی باتوں کی معافی مانگ لے۔

مگر بہت نہ ہوئی۔ ان سے ڈر رہا تھا۔ اور اگر صبح ہی صبح کوئی اور گزربو جاتی تو پری کو معلوم ہو جاتا تو کرجان جاتے۔ اور تو اور..... آوازیں می کے کانوں میں پہنچ جاتیں اس کے لئے تو وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

اس نے ملازم سے پوچھا:

”پری کہاں ہے؟“

وہ بولا: ”جی وہ تو جی ہی اٹھ بیٹھی تھیں پھر سزیمیک کے گھر چلی گئی ہیں۔“

دلا ویز نے وہیں بیٹھ کر چائے منگوائی ایک پیالی چائے کی پی۔ اور بیٹھی سوچ رہی تھی کہ پری اپنے لمبے بال جھلاتی اچھلتی کودتی آگنی۔ دوڑتی ہوئی آئی اور دلا ویز کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے رخسار پر پیار کر لیا۔ اور بولی:

”دل باجی..... صبح بہت مزہ آیا میں اور آئی بیگ دور تک ٹہیلے گئے تھے۔“

پری ابھی تک می کو آئی بیگ کہتی تھی۔ اور وہ منع بھی نہیں کرتی تھی۔ بچے جو رشہ دل سے اپنا لیتے ہیں وہی ان کو اچھے لگتے ہیں۔

دلا ویز گم سم بیٹھی رہی..... تو پری نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا اور پھر زمین پر بیٹھ گئی اور بڑے تردد سے پوچھا:

”دل باجی آپ کو کیا ہوا ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں..... دلا ویز نے فوراً کہا۔

”نہیں کچھ تو ضرور ہوا ہے آپ کی آنکھیں سوچی سوچی ہوئی ہیں جیسے آپ روئی

ہوں۔“

معصوم پری کو سارا درد و سوئپ دینا چاہتی تھی آنسوؤں کا ایک تیز و تند دھارا گر گیا..... تو پری نے پھر ہمت کر کے پوچھا:

”دل باجی! آج آپ اتنا کیوں روری ہیں؟ پلیز بتائیں..... بتائیں نا پلیز..... نہیں تو میں بھی رونا شروع کر دوں گی!“

”نہیں پری۔“ دلا ویز بھاری آواز میں بولی: ”تم نہیں رونا میرے ہوتے ہوئے تم کبھی نہ رونا۔“

”پھر بتائیں نا آپ کو کیا ہوا ہے؟“

”مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا پری.....“ دلا ویز نے آنسو روکے مگر پری کو اسی طرح اپنے ساتھ چمٹائے رکھا۔ اس کے رخسار پر اپنا رخسار رہنے دیا اور رک رک کر کہنے لگی:

”پری..... تمہیں مجھ سے پیار ہے نا؟“

”ہاں ہے دل باجی..... آپ تو اتنی پیاری ہیں۔“

”پری تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے۔“

”نہیں دل باجی..... آپ سے کس نے کہہ دیا ہے۔“

”پری..... میں تم پر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں..... پری.....“ دلا ویز نے روتے ہوئے کہا۔ ”مگر..... مگر..... تمہارے اچھے لہجے میں تم سے پیار نہیں کرتی۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ پری نے اپنا آپ چھڑانا چاہا۔ مگر دلا ویز نے اسے زور سے پکڑے رکھا۔

”دل باجی آپ تو مجھے اپنی امی سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔“

”پری تم میری بیٹی ہونا۔؟“

”ہاں ہاں.....“

”تو بتی مجھے امی کہا کرو..... امی..... میرا دل ترستا ہے کوئی مجھے ماں کہے..... میں بھی کسی کی ماں ہوں.....“

”دل باجی..... آپ میری ماں ہیں..... دل باجی میں آپ کو ماں سمجھتی ہوں..... دل باجی آپ سی نے تو کہا تھا مجھے دل باجی کہا کرو..... دل باجی کہنا تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“

”دلا ویز ایک دم ہوش میں آگئی۔“

اور بولی: ”ہاں ہاں تم مجھے دل باجی ہی کہا کرو..... امی نہ کہنا۔ اس سے تمہارے ابو کو تکلیف ہوگی۔“

یہ کہہ کر جو نظر اٹھائی تو سامنے قطب صاحب کھڑے تھے دلا ویز ڈر گئی اس نے پری کو چھوڑ دیا جانے کب سے قطب صاحب یہاں کھڑے اس جذباتی منظر کا نظارہ کر رہے تھے۔

”ابلی ابلی.....! نہیں دیکھتے ہی پری ان کی طرف دوڑی۔“ دیکھیں..... دل باجی کی طبیعت خراب ہے۔ پلیز ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں نا۔“

گمردہ دلا ویز ان کا جواب سننے کے لئے وہاں نہیں ٹھہری۔ اپنے کمرے میں آگئی۔

☆.....

پری کو سلا کر..... سارے گھر کی قیام بجا کر دلا ویز اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

• نے سے پہلے وہ کوئی کتاب ضرور پڑھا کرتی تھی۔ آج کا سارا دن ہی تھکا دینے والا تھا۔ یوں تو چھٹی کا دن تھا۔ قطب صاحب سارا دن گھر پر ہی رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی سب نے مل کر ہی کھایا۔ دلا ویز ان کے سارے کام دوڑ دوڑ کر کرتی رہی۔ ان کے چہرے کے تاثر

تے پر بھی سے کوئی آواز نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس لئے دلا ویز آ کر اپنے کمرے میں لیٹ

نی جب سنا تا ہر سوچا گیا تو اسے اپنے کمرے میں چا پ سی سنائی دی..... مڑ کر دیکھا تو

بانک کے پاس قطب صاحب کھڑے تھے۔ وہ اتنی حیران ہوئی کہ اٹھنا بھول گئی۔ وہ مسکرا کر

انہوں نے ادا سی سے کہا۔ ”میں نے کئی بار سوچا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ظلم کر رہا ہوں، مگر اس ظلم کی تہمتا منے کی تھی۔“ ان کا چہرہ اور بھی قریب آ گیا۔

”مرد بار بار اظہار محبت کرے تو اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ میرے ساتھ ضد نہ کیا کرو میرے پاس وقت نہیں ہے میں ایک مظلوم انسان ہوں۔“

قطب صاحب کے لہجے میں استعجاب تھا۔ اس وقت دلا ویز کو ان پر بڑا ترس آیا۔ ان کا چہرہ اس قدر قریب تھا کہ وہ ایک ایک نقش کو غور سے دیکھنے لگی۔ ان کی گردن کے نیچے تھوڑا تھوڑا اس اکٹھا ہو گیا تھا۔ جوان کی عمر کی چغلی کھا رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد بہت سی لکیریں تھیں۔ لکیروں کے ساتھ حلقے بھی تھے۔ سر کے بہت سے بال سفید تھے۔ ان کی آنکھیں..... ان کی آنکھیں بالکل خالی تھیں۔ ہر جذبے اور ہر عنایت سے اور پھر بھی اس نے ان آنکھوں کو چھیننے کی جسارت کی تھی۔ ان ہونٹوں کو برہم کرنا چاہا تھا۔ ان ہاتھوں میں بکھرتا چاہا تھا۔ اور اس گریبان سے مدھ بھری خوشبو کے پیالے پینے چاہے تھے۔ بعض اوقات تہمتا منے کی ضدی ہو جاتی ہے۔

”میں تم سے کسی ضدی کی توقع نہیں رکھتا دلا ویز.....“ انہوں نے سانسوں جیسی نرمی سے کہا۔

”میں نے ضد نہیں کی قطب صاحب.....“ دلا ویز ایسے بولی جیسے وزنی بوجھ کے نیچے

سے بول رہی ہو۔

”کل رات تم ضد میں تھا بوکرا اٹھ آئی تھیں۔ اور مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔“

اور کوں سا آپ مجھے منانے کے لئے چلا آئے تھے اس کا دل چاہا کہ کہہ دے مگر اس

نے کہا:

اس کے پلٹ پر بیٹھ گئے اور اس طرح بیٹھے کھانسنے کا راستہ نہ دیا۔

دلا ویز کا دل دھک دھک کرنے لگا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اگلے لمحے کیا ہو جائے گا۔

قطب صاحب بیٹھے تو اس کے چہرے کی طرف جھک کر بولے:

”عورتیں ہمیشہ روتی دھوتی نظر آتی ہیں کہ بچاری مظلوم ہیں، مظلوم ہیں۔ مردوں کے ظلم و ستم کی ماری ہوئی ہیں..... مگر مرد پر کیا ظلم ہو جاتا ہے۔ اس کا کسی کو پتہ نہیں چلتا۔“

دلا ویز ڈر کے مارے چپ رہی۔

بچارا مرد..... اگر عورت کو اپنے اوپر حرام سمجھ لے تو اس بات کا یقین نہیں کیا جاتا۔ وہ مظلوم اپنی مرحوم محبوبہ کی یاد میں زندگی بسر کرنا چاہے تو کوئی ایسا کرنے نہیں دیتا۔ اگر وہ عورت کو اپنی زندگی سے نکال کر دنیا کے لئے کچھ اور کرنا چاہے تو کوں کرنے دیتا ہے۔ مرد کے لئے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ عمر کے ہر دور میں عورت اس کی کمرزوری ہوئی چاہیے۔ عورت کے سوا اسے کسی شے کی طلب نہیں ہونی چاہیے.....؟..... آخر کیوں.....؟ عورت اس کے قریب آئے تو اسے لگھل جانا چاہئے۔ عورت کے لئے اسے ہمیشہ ٹوٹے پھوٹے رہنا چاہئے..... جو میری طرح اپنی ضد پراڑ جائے وہ ظالم اور سفاک کہلاتا ہے، ہے نا.....؟“ انہوں نے ہنس کر دلا ویز کی آنکھوں میں دیکھا، دلا ویز پہلی بار ان کا یہ روپ دیکھ رہی تھی اور سخت حیران ہو رہی تھی۔ دل الگ دھڑ دھڑا رہا تھا یوں جیسے جان لگی جاری ہو یہ ان کا ستم تھا کہ ان کی مہربانی تھی۔

”تم کل رات سے مجھ سے نفرا ہو۔ میں جانتا ہوں۔“

”نہیں۔“

دلا ویز نے صرف نفی میں سر ہلایا۔

”عورت کی نظلی کے انداز ہوتے ہیں دلا ویز..... اور میں تمہیں کبھی خفا کرنا نہیں چاہتا

کا ایک وقت مقرر ہے..... ایسیوں کے گھورا اندھیرے میں پہلی کونپل پھوٹی تھی، اور اس کا زندہ رہنے کو دل چاہا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہ بھی زندوں میں ہے۔ پری کو جب اس نے بتایا تو بیحد خوش ہوئی۔

”اچھا پری یہ بتاؤ، تمہیں بھائی چاہیے یا بہن۔“
”بھائی.....“ پری نے فوراً آنکھیں بند کر کے کہا۔
”اور اگر بہن آگئی تو؟“

”تو.....“ وہ منہ لٹکا کر بولی۔ ”بس میری قدر کم ہو جائے گی۔“
”گدھی.....“ دلاؤ نے اس کے رخسار پر ہلکی سی چپت ماری۔ تمہاری قدر کبھی کم نہیں ہو سکتی تم اس گھر کی بڑی اولاد ہو۔“

پھر وہ دونوں مل کر آئے والے مہمان کے لئے ننھی ننھی چیزیں بنایا کرتیں۔ پری نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اسے وہ اپنے کمرے میں رکھے گی.....

جس روز اس کے ہاں صحت مند ماسٹا پیدا ہوا، قطب صاحب ذرا کی ذرا ہسپتال آئے تھے۔ ان کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ یا اپنے جذبات پری سے چھپانا چاہتے تھے، البتہ پری بے انتہا خوش تھی۔ اپنی دو بچیوں ہلاتی ادھر سے ادھر بھاگی پھر رہی تھی..... ظاہر ہے بچے کو تو پری کے کمرے میں ہی رکھنا تھا۔ اس لئے دلاؤ نے اپنا پلنگ بھی وہیں بچھوایا، کچھ عرصہ کے لئے دلاؤ واپس اپنی ساری محرمیاں اور نا آسودگیاں بھول گئی یوں بھی پہلا بچہ ایک تجربہ ہوتا ہے۔ پراس تجربے سے پری اور دلاؤ واپس آکر کئی تھیں۔ مسز بیگ کو ایک ہلکا سا ہارٹ ایک ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ زیادہ تر آرام کرتی تھیں۔ سکول کا سارا کام بھی گھر پر ہی کر لیتی تھیں۔ اس پر ایک اور تکلیف دہ سانحہ ہو چکا تھا۔ جن دنوں دلاؤ واپس ہسپتال میں تھی اچانک تباہی کا انتقال ہو گیا۔ مسز بیگ پراس واقعہ کا بڑا اثر تھا۔ ان

”میں اس پر شرمندہ ہوں مجھے صحیح ہی خیال آ گیا تھا۔“

”تم نیک دل لڑکی ہو اور تمہاری نیک دلی میں پسند کرتا ہوں۔“

اس وقت دلاؤ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سانس کی رفتار تیز ہو گئی اور دل چاہا وہ قطب صاحب سے کبرے کے قطب صاحب فاسلوں میں بات نہ کریں ایک دن مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہ چھوڑیں۔ کرچی کرچی کر دیں تاکہ میں آپ کو محسوس کر لوں..... آپ کو چھو لوں..... آپ کو چھونے کے لئے میری روح ہلک رہی ہے اور میں پیاس سے تڑپ رہی ہوں۔ ایسا کنواں بن کے میرے قریب نہ آئیے۔ جس کے اوپر دھکن لگا دیا ہے۔

قطب صاحب نے اٹھ کے بقی بچھا دی۔

دوبارہ آ کر بیٹھے تو بولے:

تمہارا پیداؤنسی اور دنیاوی حق تمہیں دیا جائے گا، مگر صرف ایک بچہ..... میں نے تمہاری نیت پر شک نہیں کیا، واللہ لڑکیاں بڑی جذباتی ہوتی ہیں اور پھر اس کے بعد تم سوچنا.....
”مظلوم تم ہو یا میں.....“

☆.....

زندگی میں پہلی خوشی دلاؤ نے دیکھی جب بیچ بچ کا پیارا سا لگاڈ اس کی گود میں آ گیا، یوں لگے گی مسافت طے کرتی آ رہی تھی اب ذرا آ کے چھاؤں ملی ہے۔ ستانے سے شانہ تھکن اتر جائے اور چھاؤں بھی کس قدر ترس کر ملی تھی، قطب صاحب نے تو مہربانی کا وعدہ کر لیا..... اور اس نے بھی ارادہ کر لیا، مگر اس کے بعد بھی قدرت نے ایک سال تک اسے انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھا، کبھی کبھی وہ سوچتی شاید قدرت اسے بانجھ کھیتی کی طرح رکھنا چاہتی ہے۔ تب وہ قطب صاحب کے آگے آپ ہی آپ شرمندہ حق ہو جاتی..... ہر بہارت

کہہ دے مگر وہ گھر میں بدمزگی سے بہت ڈرتی تھی۔ اور پھر کتنے دنوں کے بعد تو اس نے قطب صاحب کو اتنے شگفتہ موڈ میں دیکھا تھا۔ چاہتی تھی اپنی خدمت گداری اور تابعداری سے ایک بار پھر انہیں زندگی کی ڈگر پر لے آئے۔ مگر ایک عجیب بات وہ دیکھتی تھی۔

دلا ویز تیزی سے زندگی کی ڈگر پر بڑھ رہی تھی۔ روز بہ روز اس پر روپ کا خزانہ اہل رہا تھا اور جوانی تیزی سے شعلہ فنی جاری تھی جبکہ روز بروز قطب صاحب زندگی سے دور جا رہے تھے۔

صبح کا ناشہ کرواتے ہوئے اس نے قطب صاحب کو غور سے دیکھا ان کے چہرے کے نقوش میں اضطلاح تھا۔ تین ہی سال تو ہوئے تھے ان کی شادی کو..... ان تین سالوں میں قطب صاحب اور بھی نہ حال ہو گئے..... ان کے ہاتھوں پر بے شمار سلوٹیں تھیں۔ مگر یہی ہاتھ دور دور سے اس کے دل میں آگ لگا دیتے تھے..... ان کے سینے کے بال سفید ہو گئے تھے۔ قمیض کے گریبان میں صاف نظر آ رہے تھے قطب صاحب ہمیشہ سے خوش لباس تھے۔ لباس اب بھی وہ بہت خوب صورت پہنتے تھے۔ ان کے پاس بڑے قیمتی سوٹ بوٹ اور نائیاں تھیں، لیکن سوٹ بوٹ اور نائیاں بہت دن تک دل کو سہارا نہیں دے سکتیں..... ان کی طبیعت میں لا پرواہی بے نیازی اور غور شادی سے پہلے دلا ویز کو بہت اچھا لگتا تھا اور وہ سمجھتی تھی۔ مرد شادی کے بعد عورت کی طرف جھکا آتا ہے..... اور نہیں تو مجبوری سمجھ کر..... شادی کے بعد اسے معلوم ہوا..... شادی کا ایک عنصر دوطرف محبت بھی ہے۔ پر ایسے آدمی کو محبت کی کیا ضرورت ہے۔ جو دنیا میں محبت اور نفرت کی امتداد کچھ چکا ہو۔

جب سے دلی پیدا ہوا تھا۔ وہ قطب صاحب کو گھر میں اٹھے بیٹھے، چلے پھرتے ہوئے خوب غور سے دیکھا کرتی، بعض دفعہ وہ اس کی نظری چوری پکڑ لیتے۔ اس وقت وہ نگاہ کا

کے انتقال پر تو حید بھی آیا تھا۔ ان دنوں غالباً اس کی پوسٹنگ راولپنڈی میں ہو گئی تھی مگر وہ دلا ویز کو ملنے ہسپتال نہیں آیا تھا۔ اس کی چھٹی خیم ہو گئی تھی اور وہیں سے واپس چلا گیا تھا۔ دلا ویز کو زندگی میں پہلی بار انوکھی خوشی ملی تھی۔ اس انوکھی خوشی میں وہ سارے جگ کو بھلائے بیٹھی تھی.....

ایک دن جب وہ بچے کو خوب سنوار کر پیار کر رہی تھی قطب صاحب آ گئے اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر بولے:

”بھئی تم نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ بچے کا نام کیا رکھا ہے؟“

دلا ویز کو خوشی ہوئی کہ کسی بات پر قطب صاحب نے پہلی بار اپنی دلچسپی ظاہر کی تھی۔

”آپ ہی کوئی نام بتادیں؟“

”نام رکھنا تو خواتین کا کام ہوتا ہے“ کیونکہ یہ افسانے وغیرہ زیادہ پڑھتی ہیں نا؟“

”مجھے افسانوی نام نہیں رکھنا ہے جی۔“

”اس کا مطلب ہے تم نے نام تو سوچ لیا ہے۔“

”جی ہاں ایک نام میں نے اور پری نے سوچ لیا ہے۔“

”کیا میں اس قابل ہوں کہ مجھے بتایا جائے۔“

”جی ہاں۔“ دلا ویز ہنس پڑی۔ ”ولی۔“

”ولی..... ولی بھی کوئی نام ہوا۔“ وہ بولے۔

”اگر آپ کا نام قطب ہو سکتا ہے تو آپ کے بیٹے کا نام ولی کیوں نہیں ہو سکتا؟“

”ہاں..... یہ بھی ٹھیک ہے۔“ انہوں نے جلدی سے پائپ منہ کے ساتھ لگا لیا۔

”مگر میں نے قطب ہو کر کیا کر لیا ہے؟“ تھوڑی دیر بعد وہ بولے۔

”دلا زاری تو کر رہے ہیں اس سے بڑا اور کیا کام ہوگا؟“ دلا ویز کے جی میں آئی

پری اسے خیالوں میں مگن چھوڑ کر چلی گئی تھی پھر ایک چکر لگا کر آ گئی۔

”آخر آپ اتنی چپ چاپ کیوں رہتی ہیں؟“

”بھئی اب تم ایک فضول سی بات کے لئے ضد کر رہی ہو تو میں کیا جواب دوں۔“

”کہیں ابو سے تو لڑائی نہیں ہو گئی۔“

”نہیں نہیں.....“ دلا ویز تھرا کر بولی۔ ”میں کوئی پاگل ہوں جو ان سے خواہ مخواہ لڑوں

وہ تو اتنے اچھے ہیں۔“

”اصل میں میری امی کی جب ابی سے لڑائی ہو جاتی تھی تو وہ اس طرح چپ چاپ رہا

کر تیں۔“

”پھر اس کے بعد کیا ہوتا تھا.....“ نہ چاہتے ہوئے بھی دلا ویز نے پوچھ لیا۔

”پھر ایک دو دن کے بعد ابی خود ان کو منا لیتے تھے۔ کہتے تھے گھر میں میرا بیٹا نہیں

گلتا..... میرے ساتھ بولو۔“

دلا ویز کو یوں لگا کہ اس نے اس کے دل میں چٹکی بھری ہے۔ وہ بھی تو دنوں ہفتوں چپ

رہتی تھی، ضروری بات کے علاوہ قطب صاحب سے کوئی بات ہی نہ ہوتی تھی، مگر ان کو محسوس

تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے۔ دلا ویز اسی طرح فاصلے پر رہے۔ ان کے اعصاب پر سوار

نہ ہو ہر وقت انہیں نظر نہ آئے..... بیٹھے بیٹھے دلا ویز نے ایک آہ بھری پھر پری کی طرف

دیکھا۔ پری ابھی تک اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”پری جس روز تم ہمارے گھر آئی تھیں تم نے کہا تھا کہ میرا نام کتنا عجیب ہے۔“

”کہا تھا؟“

”ہاں.....“ پری نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

”تو تم نے کہا تھا اگر آپ گر جائیں..... تو کوئی کیا کہے گا۔ دل گر گئی ہے یا دل گر گیا

زایہ بدل دیتی..... پھر اسے ممی کا خیال آ جاتا ممی ٹھیک ہی تو کہتی تھیں۔ عمر کا فرق بہت بڑی

اذیت بن جاتا ہے۔ وہ تو قطب صاحب سے دو بدوڑی نہ سکتی تھی۔ بیچ میں احترام کی دیوار

آ جاتی..... یا پھر..... قطب صاحب کا لب و لہجہ اسے دور کر دیتا۔

”دل باہی.....“

ایک دن پری اس کے سر ہو گئی۔

”اب آپ کچھ کچھ خاموش ہو گئی ہیں۔“

”اچھا..... پہلے کیسی تھی؟“

”پہلے تو خوب ہنسا کرتی تھیں۔ مجھے کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ہم مل کر نینس کھینے جاتے

تھے۔ اور باورچی خانے میں گھس کر کچوان پکاتے تھے۔ اور اب..... اب تو آپ زیادہ بات

ہی نہیں کرتیں اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جاتی ہیں۔“

”دراصل ولی کی پیدائش کے بعد میں بہت مصروف ہو گئی ہوں۔“

”ولی بچارا کیا کرتا ہے۔ سارا وقت تو میرے ساتھ کھیلتا ہے پھر اسے آنٹی بیک سنبھال

لیتی ہیں بیچ سارے کا مٹوا اس کے آنٹی بیک کر دیتی ہیں۔

”ہاں.....“ دلا ویز نے سوچا۔ ممی ولی پر جان دیتی تھیں۔ ممی کو بچوں سے بہت محبت

تھی۔ ان کا دل چاہتا۔ دلا ویز کے بہت سے بچے ہوں۔ ایک سال اس کا بچہ نہیں ہوا تو ممی کو

کتنا فکر تھا۔ مگر اب وہ خوش تھیں۔ سارے اگلے پچھلے گلے شکوے بھول گئی تھیں۔ ولی تو

دلا ویز کو کوئی تکلیف نہ دیتا تھا۔ ویسے بھی بڑا نرس کھو وصحت مند بچہ تھا۔ پری سارا دن اسے

کمر پر اٹھائے رکھتی۔ پری کو بھی ایک کھلوٹا مل گیا تھا۔ ان دونوں کا پیار دیکھ کر قطب صاحب

بہت خوش ہوتے تھے۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”ہے۔“

”پتہ نہیں..... مجھے تو یاد نہیں.....“ پری نے نجل مندی سے کہا۔

”تو بات یہ ہے کہ میں گر گئی ہوں۔“

”کہاں سے؟“ پری نے تردید سے پوچھا۔

”نہیں میں نہیں گری..... میرا دل گر گیا ہے۔“

”کہاں کہاں دل باجی..... پری نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

زمین پر..... مٹی پر..... راکھ پر.....“

دلاؤ دیزنے ہنس کر کہا۔

”تو اٹھ لیجئے نایہ بھی کوئی بات ہوئی۔“

”پرو..... تو نہیں جانتی..... گرا ہوا دل خود نہیں اٹھ سکتا۔ اس کو ہمیشہ دوسرے اٹھاتے

ہیں۔“

”میں اٹھا دوں..... دل باجی؟“

”نگلی تو نے ہی مجھے اٹھایا ہوا ہے۔“

☆.....

بہت دنوں سے سکول کے بچوں کی کاپیاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ آج شام کو دلاؤ دیز نے یہ سارا کام نھانے کا تہیہ کر لیا اور کاپیاں لے کر لابی میں آ بیٹھی۔ پری اور ولی باہر لان میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔ اب ولی نرسری سکول جاتا تھا۔ بڑا تیز اور ذہین بچہ تھا۔

دونوں نے لان میں خوب اودھم مچایا ہوا تھا۔ اسی وقت چوکیدار اندر آیا۔ سیلوٹ مار کر

بولاً:

”جی میجر صاحب آئے ہیں؟“

”کون میجر صاحب.....؟“

دلاؤ دیز نے کاپی پر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کتنی بار کہا ہے کہ نام پوچھ کر آ یا کرو۔“

”جی چاہتا تھا..... چوکیدار منہ لٹکا کر بولا۔“ ان صاحب نے بولا کہہ دو بس میجر

صاحب آئے ہیں۔“

”اب یہاں دن میں کئی لوگ بچوں کے داخلے کے ضمن میں آتے تھے۔ پتہ نہیں اندر

بلانا ہے کہ نہیں“ شام کا وقت تھا۔ قطب صاحب تو اس وقت گھر پر نہیں ہوتے مگر وہ اسکول

کے لوگوں کو اس وقت نہیں ملا کرتی تھی۔ صبح کو آفس میں ہی ملتی تھی۔

”تم نے میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔“

”جی صاحب!“ چوکیدار مسکین شکل بنا کر بولا۔ ”انہوں نے پوچھا بیگم صاحب گھر پر

ہے، ہم نے کہا جی جناب!“

”اچھا..... دلاؤ دیز نے خفگی سے کہا۔“ جاؤ انہیں اندر بھیج دو۔“

پھر بیدلی سے اس نے دوپٹہ ٹھیک کیا۔ کاپیوں کو ترتیب سے رکھا اور سوچا اگر داخلے

کے لئے آئے ہوں گے تو صاف کبدے گی کہ صبح دفتر میں تشریف لائیں یہ سوچ کر پھر اسی

انہماک سے کاپی دیکھنے لگی..... ایک لمبا بڑا لٹکا ہوا نوجوان روڈی میں ملیں سر پر فوجی کپ

پہنے اندر کو آتا نظر آیا۔ وہ نظر اٹھا کر دیکھنے لگی، قریب آ کر اس نے سیلوٹ مارا تو دلاؤ دیز کی

چٹ نکل گئی۔ ہاتھ میں پکڑی کاپی دور پھینک کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”بائے اللہ توحید..... توحید یہ تم ہو.....“ اس نے سر سے لے کر پیر تک توحید کو

دیکھا۔ ”تم توجہ مجھے فوجی افسر کر رہے ہو۔“ اس کا دل چاہا دوز کر توحید کے گلے سے

لگ جائے۔ جی بھر کے اس کو ملے۔ اس کو یوں اپنے سامنے دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ جیسے

”لیکن میں تو تہارے پرانے کمرے میں رہوں گا اسی کمرے میں جس میں بیٹھ کر ہم ہمیشہ لڑا کرتے تھے۔“

”ہاں.....“ دلا ویز نے جلدی سے نظریں جھکا لیں، آنسوؤں کی تیز بوجھاڑ آئی تھی..... اور ملاقات کے پہلے لمحے وہ بودی ثابت نہیں ہونا باقی تھی۔ اس لئے اس نے نظریں جھکا لیں اور گلوگیر آواز میں بولی: ”جی تمہیں آخر وقت تک یاد کرتی رہیں تو حید..... کیا تم جی سے بھی ناراض ہو گئے۔“ اور یہ کہتے ہی اس نے طوفانی انداز میں گھر آنے والے آنسوؤں کو راہ دی۔ سارے آنسوؤں کے نام کر دیئے۔

جب ولی دو سال کا ہوا تو می اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ می کو ایک اور بارت ایک ہوا..... اور اس چند گھنٹوں میں ان کا معاملہ اللہ سے ہو گیا۔ زندگی میں ماں محبت کا ایک بھر پور دھارا ہوتی ہے۔ ان کے جانے کے بعد دلا ویز نے چپ کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا نہ کسی بات پر الجھتا..... اپنی محرومیوں کو اپنی زبان دیتی۔ پتہ نہیں می کے جانے کے بعد وہ کیوں اتنی تنہا ہو گئی تھی۔ پھر می کے مشن کو زندہ رکھنے کے لئے اس نے ساری توجہ سکول کی طرف مبذول کر دی تھی..... اب ”بوستان آرزو“ ہائی سکول بن گیا تھا اور اپنی کارکردگی کی وجہ سے اس کی شہرت دور دور پر پھیل گئی تھی۔ سکول کا کام کرتے وقت دلا ویز کو محسوس ہوتا تھا کہ اپنی آرزوؤں کا رخ موز دینا کتنا کرنا کٹنا اطمینان بخش ہے۔ دوسروں کے لئے جینا اور ان کی زندگی سننا آتنا بڑا مقصد ہے۔ اور اس مقصد کے لئے وہ جی سکتی تھی۔

”میں کسی سے ناراض نہیں ہوں دل۔“ تو حید نے آہستہ سے کہا۔ شدت غم سے اس کا منہ بھی لال ہو گیا۔ کتنے عرصے بعد کتنے پیارا اور اعتماد سے اس نے دل کہا۔ دلا ویز کے دل میں تنہا جاگی کہ بس اسی لمحے اس کا دھڑکن سارا خاموش ہو جائے۔ زخم اپنے مرہم کے لئے تر پنے لگے۔

عرصہ دراز کے بعد غیروں کی نگرانی میں کوئی اپنا نظر آ یا ہو۔ تب اسے ایک دم احساس ہوا۔ کہ اپنائیت کیا ہوتی ہے..... ہاتھ پھیلائے کھڑی رہ گئی کیونکہ تو حید تو اپنی جگہ سے بس سے مس نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ ذرا سی پیشواں کرتا تو دلا ویز دوڑ کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔

”جینے کو نہیں ہوگی؟“

تو حید نے شرارت سے کہا تو دلا ویز کو ہوش آ گیا۔

”بیٹھو بیٹھو.....“ کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ وہ اس طرح بیٹھا جیسے غیروں کے گھر میں بیٹھتے ہیں یا تھم میں پکڑی ہوئی ٹوپی میز پر رکھ دی۔

”تو حید.....“ دلا ویز نے لمبی سانس چھوڑ کر کہا۔ یقین نہیں آ رہا کہ تم میرے گھر آئے ہو۔ کتنا عرصہ ہو گیا۔ ہمیں ملے ہوئے آنکھیں بند کر دو کہ حساب جوڑنے لگی۔

”تم حساب میں سدا کی کمزور ہو۔“ تو حید شوخی سے بولا۔ ”ناحق حساب مت لگاؤ اپنا حال سناؤ کیسی ہو؟“

”کوئی اور زمانہ ہوتا تو وہ کبھی نہ ماتی کہ وہ حساب میں کمزور ہے۔ وہ تو حید کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف نہیں کرتی تھی۔ مگر اب آہستہ سے بولی۔

”ہاں تو حید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا حساب واقعی ہمیشہ کمزور رہا۔ اچھا تم بتاؤ۔ کیسے آئے ہو کیا ڈیوٹی پر آئے ہو؟“

”جی نہیں.....“ وہ بولا۔ ”فی الحال تو ایک مہینے کی چھٹی پر آیا ہوں۔“

”اور سامان کہاں سے تمہارا؟“ وہ بے چینی سے بولی۔

”تمہارا دروازے کے باہر پڑا ہے۔“

”ہائے اللہ.....“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”تمہارا سامان می کے گھر میں رکھ دوں۔ می کے گھر کو اب ہم نے گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا ہے۔“

پچھانتے ہو؟“

”اوئے پری..... اس نے اٹھ کر ہاتھ آگے بڑھایا مگر پری ابھی تک اپنی خوبصورت سنہری آنکھیں جھپک رہی تھی۔

”پری انہیں پچھتا ہے۔“ دلا ویز نے مسکرا کر پری کی طرف دیکھا۔ پری نے نفی میں سر ہلادیا۔

”ارے یہ تمہارے تو حیدر اکل ہیں۔“

”اوئی میں مری.....“ یہ کہہ کر بغیر ہاتھ ملائے پری اندر بھاگ گئی۔ دلا ویز نے آواز دے کر کہا:

”پری خان محمد سے کہو چائے لائے۔ اور ولی کا حلیہ ٹھیک کر کے اسے بھی لاؤ۔“

”تھوڑی دیر بعد منہ ہاتھ دھو کے قرینے سے دوپٹہ اوڑھے ہوئے اور ولی کی انگلی پکڑے ہوئے پری شرماتی لپٹائی آگئی۔

”یار لڑکیاں کتنی جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔“ تو حید نے حیرت سے پری کو دیکھتے ہوئے دلا ویز سے کہا۔

”تمہیں یاد ہے پری..... تم سارا دن تو حید کے کاندھوں پر بیٹھی رہتی تھیں اور یہ تمہارا گھوڑا بنا کرتا تھا۔“ پری نے سر جھکا لیا تھا۔

خان محمد چائے لے آیا۔

”تو حید نے آگے بڑھ کر ولی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے گھٹنوں میں پھنسا کر بولا:

”خلاف معمول صاحبزادے کچھ شریف معلوم ہو رہے ہیں کیوں بھی۔“

”میں ہرگز شریف نہیں ہوں جی۔“ پانچ سالہ ولی نے بے دھڑک کہا۔

”دوستی کرو گے؟“ تو حید نے پوچھا۔

ہاں شروع شروع میں میں کچھ بے وقوف اور جذباتی سا تھا۔ ابوجی کی وفات پر چند دنوں کے لئے آیا تھا۔ سنا تھا تمہارا بیٹا ہوا ہے اور تم ہسپتال میں ہو مگر تمہارا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے چلا گیا تھا مگر چچی جان جب فوت ہوئیں تو میرا نیا نیا بدلہ لگلت میں ہوا تھا۔ ان دنوں شدید سردی تھی۔ برف باری کی وجہ سے سارے راستے بند تھے۔ حتیٰ کہ ایک ہفتے سے فلائٹس بھی رگ گئی تھیں۔ میں فوراً نہ سکا۔ بعد میں..... بس یونہی دیر ہوئی رہی میں نے سوچا۔ اگر وقت پچھنچ سکا۔ تو پھر جب بھی موقع ملا چلا جاؤں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے مجھے چچی جان کے جانے کا غم نہ تھا۔ تمہاری تو ماں تھیں دل مگر..... مگر میرے لئے کیا تھیں۔ تم کیا جانو.....!“

اتنی دیر میں دلا ویز خوب روکھو تھی۔ اپنے دوپٹے کے پلے سے اپنا چہرہ صاف کر نے لگی تو حید کے آتے ہی اسے نہیں روکا چاہئے تھا مگر کیا کرتی جب دل الباب بھرا ہو تو کوئی اپنا سا نظراًئے تو یہ نہ پھلک جاتا ہے۔

اسے چہرہ صاف کرتے دیکھ کر تو حید نے بات بدل لیتے ہوئے کہا:

”بھئی وہ تمہارا بر خوردار کہاں ہے۔ مجھے بہت شوق تھا تمہارے بچے کو دیکھنے کا..... کیا نام رکھا ہے؟“

”ولی نام ہے اس کا..... ابھی باہر کھیل رہا تھا میں اسے بلاتی ہوں۔“

دلا ویز نے اٹھ کر دو تیس آوازیں دیں..... ولی..... ولی بیٹا..... اندر آؤ بیٹا..... لیکن ولی کی بجائے سڑپ سڑپ کرتی ہوئی اور لمبے بال جھلاتی ہوئی پری اندر آ گئی..... پاؤں سے تنگی..... دوپٹے کے بغیر..... ہاتھ اور پاؤں مٹی سے لٹھرے ہوئے۔

”اوئی.....“ ایک دم اندر آ کر جھک گئی۔

”آؤ..... آ جاؤ پری.....“ پھر دلا ویز نے تو حید کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ پری ہے اسے

”ضرور کروں گا۔“ وہ بھی بولا۔

”ملاؤ ہاتھ۔“

”ملائیں ہاتھ..... اس نے بھی اپنا ہاتھ نکال لیا۔

پھر کھانے کی چیزیں نرالی پر دیکھ کر بولا۔ اب میرا ہاتھ چھوڑیں بھی مجھے جھوک لگ رہی ہے۔ باقی دوستی کھانے کے بعد.....“

اس پر توحید نے قہقہہ لگایا اور دلاؤ ویز کی طرف دیکھ کر بولا:

”تمہارا بیٹا امپریس کر گیا ہے مجھے.....“

☆.....

میز پر بڑا تکلف کھانا چٹا ہوا تھا اور بہت دلچسپ گفتگو ہو رہی تھی۔ پری بھاگ بھاگ کچن میں جا رہی تھی۔ اور گرم گرم پکوان لاکر میز پر رکھ رہی تھی۔ دلاؤ ویز میز کے سرے پر یوں بیٹھی تھی جیسے مدبر اور فراست کی گھڑی اپنے سپر پرائیمر اٹھارہ کی بوکھلے صاحب اپنے اسی دھیمے دھیمے پراعتماد لہجے میں باتیں کر رہے تھے اور توحید پورے انتہاک سے سن رہا تھا تو حید کی نظروں میں احترام تھا، تسخیر نہیں تھا۔

اور جب سے توحید آیا تھا، گھر میں ایسی محفلیں جاری تھیں۔ عام طور پر توحید صبح کا ناشتہ کر کے باہر نکل جاتا تھا اور پھر کبھی شام کو اور کبھی رات گئے گھر آتا تھا۔ صبح کی چائے اور شام کی چائے تو گھر پر ہی لیتا تھا مگر کھانا عام طور پر باہر کھاتا تھا اگر بیک دلاؤ ویز پوچھ لیتی تو کہتا۔

بے شمار یاد ہیں اپنے..... اتنے عرصے بعد آیا ہوں اب سب کو خوش کرنا ہے۔“

کتنی بار دلاؤ ویز کا دل چاہتا اسے کہے:

”رات کو اتنی دیر سے کیوں آتے ہو۔ جب تک تم آ نہیں جاتے۔ میں سوتی نہیں کھلی آکھوں سے چھت کو دیکھتی رہتی ہوں۔ پھر وہ سوچتی توحید کہے گا تم کیوں نہیں سوتی ہو۔“

تمہیں کیا تکلیف ہے۔ اور اپنے لئے تمام رات جاگنے کا روگ میں نے تمہیں کب بخشا ہے۔“

انتا کافی نہیں کراس کے آنے سے سویا ہوا گھر جاگ اٹھا تھا، گھر میں زندگی آگئی تھی ہر وقت کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا۔ پری اور ولی اس کے ہر پروگرام میں شامل ہوتے کبھی سب لوگ یونٹنگ کے لئے راوی چلے جاتے..... کسی روز کرکٹ کھیلنے کا پروگرام بن جاتا سارے محلے کے بچے اکٹھے کئے جاتے اور گھر میں وہ شور مچا ہوتا کہ لالا ماں..... کسی شام ڈنر چائیز میں کھایا جاتا اور کبھی بننے بنانے والی فلم دیکھنے کا پروگرام بن جاتا۔

ایک شام جب سب جا رہے تھے تو قطب صاحب نے آہستہ سے دلاؤ ویز سے کہا تھا۔

”دلاؤ ویز! تم بھی چلی جاؤ!“

”کہاں.....؟“

دلاؤ ویز نے حیران سی آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

”بھئی توحید پری اور ولی کو کچھ دیکھانے لے جا رہا ہے۔ تم بھی جاؤ۔“

”مجھے فلوں سے دلچسپی نہیں ہے.....؟“

”کب سے؟“ قطب صاحب نے ہنس کر پوچھا۔ ”پہلے تو تمہیں بہت شوق تھا۔“

پہلے میں اور اب میں بہت فرق آ گیا ہے۔ قطب صاحب.....؟“

”آتی طلدی نہیں۔“ انہوں نے ہنس کر کہا۔ ”جاؤ تم بھی چلی جاؤ۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ کڑھائی ہو گئی۔ ”مجھے آج سکول کا حساب کتاب دیکھنا ہے۔“

اچھا ہے شور کم ہو جائے گا تو میں سکون سے کام کر سکوں گی۔“

وہ اندر کو جانے لگی۔

(تیز رفتار لوگوں کا میں ساتھ نہیں دے سکتی۔ قطب صاحب! بعض اوقات ایک تازہ

دم اور توانا کھلاڑی پہلے راؤنڈ میں اتنی تیز دوڑتا ہے کہ گر کے جوت گھوا بیٹھتا ہے۔ پھر وہ زندگی بھر دوڑنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔)

کبھی کبھی وہ لابی میں بیٹھ کر ان تینوں کو پچوگرم بکھیتا ہوا دیکھتی، تو حید بھاگ بھاگ کر گیندیں اچھالتا اور پھر دونوں کی اچھی پٹائی بھی کر دیتا۔ وہ پوری اورولی کے ساتھ مسلسل دوڑتا رہتا۔ اور انہیں تھکا تارہتا۔ ایسے لگتا جیسے تو حید کے اندر بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اور تو حید کس قدر خوبصورت ہو گیا تھا۔ پہلے وہ لمبا ترنگا ایک بے ڈھنگا سالزاکا تھا۔ نہ کچھ پہننے کا سلیقہ تھا۔ نہ کوئی لباس اس پر چلتا تھا، ہر لباس میں یوں محسوس ہوتا، جیسے اندر بانس کا انسان ہے۔ مگر اب اس کا جسم بھر گیا تھا۔ قد اور بھی لمبا لگتا تھا۔ پہلے دن وہ فوجی یونیفارم پہن کر آیا تھا، تو دلاؤ ویز بس اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا۔ یہ یونیفارم اس جیسے خورونو جوان کے لئے بنایا گیا ہے ایسے ہی نو جوانوں کو دیکھ کر فوجیوں کو اس نے اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا۔ مگر پہلے پہلے جب تو حید سینکڑی فیٹس کی وردی پہن کر آیا تھا، تو اتنا بے ڈھنگا لگ رہا تھا کہ اس کی طرف دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے تو ہماری بھر کم مضبوط و توانا سخت بازوؤں والے آدمی پسند تھے۔ ایسے بازو اب تو حید کے ہو گئے تھے۔

جب بھی آدھی آستیموں کی ٹی شرٹ پہن کے آتا۔ وہ مسلسل اس کے خوبصورت بازوؤں کو دیکھتی رہتی، کھیلے وقت وہ سفید نیکر اور شرٹ پہن کر آتا تھا۔ شام کی چائے پر عام طور پر شلو اور قمیض پہن لیا کرتا تھا۔ تو حید ہر لباس میں بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلا کی چمک تھی۔ چہرے پر ایک سرخی رہتی تھی۔

آنکھیں بولتی ہوئی اور بے چین تھیں۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ لڑنا چاہتی ہیں۔ الجھنا چاہتی ہیں۔ سب کچھ سمجھیں لینا چاہتی ہیں۔ اس پر تو کوئی بھی لڑکی سرکشی تھی۔ وہ صحت و توانائی کا چلتا پھرتا اشتہار تھا، اور پھر ذہانت میں بھی کچھ کم نہیں تھا۔ پہلے اسے وہ بالکل احمق اور

بے وقوف دکھائی دیتا تھا۔ ہر بات میں عشق کا رونا روتا رہتا تھا۔ بات بے بات لطیفے سنایا کرتا تھا۔ اور اس کو تنگ کرنے کی خاطر غلط غلط محاورے بولا کرتا تھا۔ مگر اب وہ بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتا تھا۔ مگر دلاؤ ویز کے ساتھ بہت سلیقے سے بات کرتا اور قطب صاحب کے سامنے تو وہ اتنا مؤدب بن جاتا کہ دلاؤ ویز اس کی طرف دیکھتی رہ جاتی۔ کوئی بحث شروع ہو جاتی تو انگریزی یاد دلاؤ ویز میں اتنے موزوں جواب دیتا قطب صاحب لا جواب ہو جاتے۔ کبھی کبھی انہیں اپنی مہمات کی کہانی سناتا۔ اس وقت دلاؤ ویز کا دل چاہتا۔ اس کے گریبان کے دونوں کونے پکڑ کر پوچھے۔ تو حید تم نے یہ سب کچھ کیسے سیکھا۔؟ تم ایسے کیسے ہو گئے۔ تم نے اپنے آپ کو چھپا کر کیوں رکھا ہوا تھا۔؟

پھر وہ اپنے آپ کو فحشی جواب دیتی اور کہتی:

لڑکیاں بالکل ہوتی ہیں انتظار نہیں کر سکتیں۔ آخر میری اور تو حید کی عمر میں دو سال کا ہی تو فرق تھا۔ ایک دن اس نے مربوط اور مضبوط نو جوان بننا تھا۔ اس پر نکھار آتا تھا۔ ہر بات کے لئے وقت درکار ہے، لیکن ہم لڑکیاں انتظار نہیں کر سکتیں۔

”لڑکے صحیح مرد بھی بن جاتے ہیں اور اچھے عہدوں پر بھی پہنچ جاتے ہیں، مگر تھوڑا وقت لگتا ہے۔“

کبھی کبھی وہ یونی انجانے میں تو حید کا ققب صاحب سے موازنہ کرنے لگتی۔ ققب صاحب برگلد کے اس درخت کی مانند لگتے جو صدیوں سے جڑیں پھیلانے کھڑا ہوا اور جس کے نیچے ٹھنڈی رخ چھاؤں ہو۔ ایسے درخت گرمیوں میں تو اچھے لگتے ہیں۔ مگر سردیوں میں کوئی ان کے نزدیک بھی نہیں جاتا، لیکن تو حید پیار کے موسم میں کھلے ہوئے اس تر و تازہ پھول کی مانند لگتا، جس کا من تمام رات شبم کے قطرے چومتے رہے ہوں اور صبح کو جو بھی دیکھتا ہے۔ تو ڈر کر کوٹ پر جا لینا چاہتا ہے۔

اپنے گھر میں ان کے بھتیجے کو لانا چاہتا ہے۔

”یہ تو ارغندا کی ایک نسل ہے قطب صاحب! تو حیدر بولا: ”لوگ ہمیشہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں، تعلیم میں تجربہ میں اور معیار زندگی میں بھی۔ اور پھر جب سے ہمارے ملک کے ہر پانچویں گھرانے کا فرد ملال ایسٹ چلا گیا ہے۔ تب سے معیار زندگی میں تبدیلی آئی ہے ہمارے ہاں لوگ مریوں کی بہت نقل کرتے ہیں۔“

”مگر یہ بھی تو دیکھو وہ کس قدر امیر ہیں۔ اور ہم غریب ہیں۔“

”اصل میں قطب صاحب جو لوگ پردیس میں محنت کر کے روپیہ کماتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ اپنے ملک میں ان کو بڑا آدمی سمجھا جائے۔ یہاں وہ بڑے بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس لئے جو فراموشی زندگی کے طور طریقے بدل لیتے ہیں۔ اچھا گھر بناتے ہیں۔ گھر کو ان کے بھتیجے اور دوسری سہولتوں سے مزین کرتے ہیں۔ موزن خریدتے ہیں۔ گویا اپنی اگلی نسل کو بدل دیتے ہیں۔“

”لیکن یہ بھی تو دیکھیں اگلی نسل کو جب محنت کئے بغیر اتنی آسائش مل جاتی ہیں تو وہ کام سے جی جدا لگتی ہے۔ عیاشی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔“

قطب صاحب نے کہا۔

”جناب جس معاشرے میں احترام بر بنائے دولت ہو وہاں اسی قسم کے نام نہاد سلیڈ رڈ بن جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جو سمجھتا ہے دولت کے عوض ہر معیار خریدنا جا سکتا ہے۔“ تو حیدر بولا۔

”مگر یہ کب تک چلے گا تو حیدر! قطب صاحب نے پانپ کا کش لے کر پوچھا۔“ آخر کب تک۔۔۔ ہمارے نئی نسلیں تباہ ہو جائیں گی! انہیں محنت کی عادت ڈالنی چاہئے۔ اب دیکھو نا! جسے دیکھو وہ منہ اٹھا کر باہر جانا چاہتا ہے! مجھے سن کر حیرت ہوئی ہے ہمارے

اسی لئے تو وہ تو حیدر کی جانب زیادہ دیکھتی نہیں تھی اور جو نظر اٹھ جاتی تو فوراً جھکا لیتی۔ خاص طور پر جب کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوتے تو وہ تو حیدر کی آنکھوں میں دیکھ کر بات نہیں کرتی تھی بلکہ چپتی سی نگاہ ڈال کر پوچھتی۔ ”بھئی تم کتاب کیوں نہیں لیتے۔۔۔؟“

اور نظر جھکا لیتی۔ وہ ڈرتی تھی اس کی آراء تو ہوئی نگاہ کی آپہنیں قطب صاحب نہ سن لیں۔۔۔۔۔ کہ تو حیدر کی جانب دیکھتے ہوتے جو واضح فرق تھا اسے وہ چھپا نہیں سکتی تھی۔ خود قطب صاحب نے تو حیدر کو بہت پسند کیا تھا اور نہ وہ اتنی دیر تک کسی کے ساتھ گفتگو نہیں کیا کرتے تھے تبھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ آ کر لابی میں بیٹھ گئے، قطب صاحب نے حسب عادت اپنا پانپ سلگایا، مگر تو حیدر ہاتھ دھو کر ادھر چلا گیا۔ تو حیدر سگریٹ نہیں پیتا تھا یہ دیکھ کر دلا ویز کو تعجب ہوا۔۔۔۔۔ اب تو اس نے قطب صاحب کے پانپ سے بھی سمجھو کر لیا تھا کسی زمانے میں یہ پانپ اسے سوتن کی طرح لگتا تھا۔ اسے کبھی پری یا اس کی مرحوم ماں سے اتنا حسد محسوس نہیں ہوا تھا۔ جتنا اسے پانپ سے حسد محسوس ہوتا۔۔۔۔۔ پانپ منہ سے لگائے بغیر قطب صاحب نہ کوئی بات کر سکتے تھے اور نہ کوئی بات سن سکتے تھے۔ مگر اب اس نے پانپ سے بھی سمجھو کر لیا تھا بلکہ ان کے کہنے سے پہلے انہیں اٹھا کر دے دیتی تھی۔

دلا ویز نے پری سے کہا وہ قبوہ بنا کر لے آئے اور خود آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ حسب عادت گوڈ میں اس نے ایک کتاب رکھ لی۔ اگر قطب صاحب پانپ میں پناہ لئے ہوئے تھے تو وہ بھی کتابوں کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ محفل میں دلچسپ باتیں ہوتی رہتیں۔ مگر وہ اپنی کتاب پڑھتی رہتی۔

قطب صاحب نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اور کہنے لگے:

”ان کے بھتیجے ہمارے ملک کی ضرورت بن گیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اب ہر کوئی

جعدار کا بھائی بھی اپنے خاندان سمیت چلا گیا ہے۔ ذرا سوچو۔۔۔
تو حیدر ہنسنے لگا پھر بولا:

”لیکن کتنی خوشی کی بات ہے قطب صاحب! کہ آپ جیسے لوگ اب واپس آرہے ہیں۔ آپ نے دس بیس سال وہاں کام کیا، لیکن پھر یہاں آگئے۔“
”ہاں بھئی! میں تو اس ارادے سے گیا تھا کہ ایک دن لوٹ آؤں گا۔ پردیس میں آدی جلد تھک جاتا ہے پھر اپنی زمین ماں کی طرح بانٹ لگتی ہے۔“ انہوں نے باپ کا ایک کش لیا۔۔۔ اور آنکھیں سیکڑ کر بولے:

”مگر یہ میرے حالات کی بد قسمتی تھی! کہ مجھے وقت سے پہلے آنا پڑا۔ ویسے تو میں نے یہ سوچ کھا تھا کہ اپنے وطن واپس آ کر انڈینشٹر بنانے کا ایک بڑا پلانٹ لگاؤں گا۔ سو مجھے پاؤں جمائے میں کچھ زیادہ وقت لگا اور زیادہ محنت بھی کرنا پڑی اتفاق سے مجھے ایک یورپین کمپنی کا تعاون حاصل ہو گیا تھا، ورنہ اتنی جلدی پاؤں کیسے جم سکتے ہیں؟“
”اپنے ملک میں جو انڈینشٹر لگوانے کا اتنا رجحان بڑھ گیا ہے تو اس سے آپ کو فائدہ ہی ہوا ہوگا۔“

”جی ہاں۔“ قطب صاحب بولے ”میں تو کہتا ہوں اگر دو چار اور کمپنیاں میدان میں آ جائیں تو ہمارا بہت سا زرمبادلہ بچ جائے۔“
لیکن ہمارے ہاں ایپوزٹڈ کا جو کرہ ہے اس کا کیا ہوگا! لوگ ملکی مصنوعات سے اجتناب کرتے ہیں۔“ تو حیدر بولا۔

”یہ مسئلہ تو ہے اجتناب ہی نہیں کرتے نفرت بھی کرتے ہیں اس میں کچھ قصور صنعت کاروں کا بھی ہے، لیکن جب اعلیٰ شینڈرڈ کی پائیدار چیزیں سامنے آئیں گی اور قیمت بھی نسبتاً کم ہوگی تو لوگوں کا رجحان ضرور بدلے گا۔“

”ہاں۔۔۔ آپ جیسے دو چار لوگ اور میدان میں آ جائیں تو قومی سطح پر تبدیلی آ سکتی ہے۔“

”بھائی۔۔۔ قطب صاحب نے باپ منہ سے نکال کر کہا۔ میں تو ساری کشتیاں جلائے بیٹھا ہوں، نہ دولت کی ہوس ہے نہ شہرت کی تمنا۔ بس دل میں کچھ کرنے کی لگن ہے چاہتا ہوں۔ انسانیت کے فائدے کے لئے کچھ کروں۔۔۔ دن رات نئی سیکمیں سوچتا ہوں اور انہی میں ڈوبا رہتا ہوں۔۔۔ یہ نیک عورت ہے۔“ انہوں نے اچانک چپ چاپ بیٹھی دلاؤ ویز کی طرف اشارہ کر دیا۔ مجھے کھلی چٹائی دے چھوڑی ہے۔۔۔ دیر سویر آنے پر کچھ نہیں کہتی، ورنہ راستے کم عرصے میں میں پاؤں کیسے جما سکتا تھا۔“

دلاؤ ویز نے پہلے تو حیدر کے چہرے کے تاثرات دیکھے پھر قطب صاحب کی طرف دیکھا۔ (بڑی جمجھوری تھی قطب صاحب! قیدی ہمیشہ دوسروں کو چھوڑ کر خوش محسوس کرتا ہے۔ آپ کی زندگی کے آدرش بڑے تھے، میرا بہت چھوٹا آدرش تھا۔۔۔ میں راستے سے ہٹ گئی۔ یہ نیکی نہیں۔۔۔ مجبور ہے۔)

”آپ نے ہمارا انڈینشٹر دیکھا۔۔۔ اچانک قطب صاحب نے تو حیدر سے پوچھا۔“ ہمارے ہیڈرو میں لگا ہے۔ دلاؤ ویز انہیں ضرور دکھانا۔ انہوں نے دلاؤ ویز کی طرف دیکھ کر کہا۔ (انہیں اپنا زخم جگر دکھاؤں کہ نہیں) دلاؤ ویز نے اثبات میں سر ہلایا۔
قطب صاحب بولتے گئے:

(”اُورا دراصل انڈینشٹر کا نام نہیں آپ کے دل کی جھنڈک کا نام ہے۔ قطب صاحب! جو نام آپ کو راحت اور جھنڈک پہنچاتا ہے اسے آپ نے لوگوں کے آرام کے لئے وقف کر دیا۔)

دلاؤ ویز گویا میں بڑی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی، پہلے دن جب قطب صاحب

”بھئی کوئی زبردستی نہیں.....“ قطب صاحب بولے۔ ”میں نے دیکھا ہے۔ کہ رلیف منجھڑیہ اور ڈیپ فریز بھی ہمارے ملک کی ضرورت بنتے جا رہے ہیں۔ آج کل ہم نے ڈیپ فریز ڈیزائن کر رہے ہیں۔ جن میں گنجانٹش تو زیادہ ہو مگر بجلی کم خرچ ہو۔ ایک چپت میں اگنے والا کوڑا بھی زیر غور ہے۔“

(ایک کمزوری عورت زیر غور نہیں۔ چلتی چلتی راہ میں آگئی تھی۔ ہم نے خوبصورت پتھر کچھ کر اس کو ایک طرف رکھ دیا۔)

.....☆.....

صبح صبح دلاؤ ویزا بیانی میں بیٹھی چائے پی رہی تھی اور حسب عادت گوڈو میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اس کے قریب سے گزر گیا ہے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ پری تھی پری نے فرے میں ایک چائے کی گرم گرم پیالی رکھی ہوئی تھی اور مسز بیگ کے گھر کی طرف چپکے چپکے جا رہی تھی۔ دلاؤ ویزا کا پیالی والا ہاتھ منہ سے پرے ہی رک گیا۔ پری ابھر کیا کرنے جا رہی ہے؟

نکستی دیر تک وہ وہ سادھے گرم صم بیٹھی رہی اسے معلوم تھا اس گھر میں اب صرف تو حید رہتا ہے اور تو حید کو علی الصبح چائے پینے کی عادت ہے۔ اور پری؟ اور کیا پری اتنی بڑی ہوگئی کہ چپکے چپکے پاؤں پہ پاؤں بھر کے اس کے قریب سے گزر رہی اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔ دلاؤ ویزا نے کتاب بند کر دی۔ اور گہری گہری سوچوں میں گھر گئی اس نے حساب لگایا اب پری سترہ برس کی تھی اور سینڈ ایر میں پڑھتی تھی۔ سترہ برس کی پری علی الصبح گرم گرم چائے کی پیالی لے کر اس کے سامنے سے نکل گئی تھی۔ اور وہ اسے روک نہیں سکتی تھی جانے کب تک گھر سے کھڑی گری قلابازیاں کھائے جاتی کہ ایک دم پری واپس آگئی اب فرے خالی تھی یعنی پری صرف چائے پکڑا کر آگئی تھی اس نے چہرہ اٹھا کر پری کو ایسی نظروں

انرا کنڈیشنر اخوا کر گھر لانے تھے تو دلاؤ ویزا کی نظر سب سے پہلے اس کے نام پر پڑی تھی۔ اوپر ہی ”ولڈن حروف“ میں ماورا لکھا ہوا تھا۔ اس کے دل میں ایک جیس سی ہوئی تھی مگر اس نے مسکرا کر نام کی تعریف نہ کی تھی۔ تب قطب صاحب نے اسے بتایا تھا کہ وہ آتا گوڈو ہنے کی ایک مشین بنا رہے ہیں۔ جس کا نام ہے۔

”پری۔“

(دیکھتے قطب صاحب! میرا نام استعمال نہ کیجئے گا! میرا نام بے سکونی اور بے آرامی کی علامت ہے۔ ہاں اگر آپ کا نونوں کی کوئی تہہ نائیں تو اس کا نام دلاؤ ویزا رکھ دیں۔)

اور پھر ہمیں کر بولے:

”ابھی ہمارے ذہن میں اور کئی تجویزیں ہیں اور کئی نام درکار ہوں گے۔“

دلاؤ ویزا ہنس پڑی اور اس نے آگے بڑھ کر ماورا کا مٹن آن کر دیا سارا کمرہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے بھر گیا تھا۔ قطب صاحب سچے پری تھے وہ اپنے کمرے میں تنہا سو یا کرتے تھے اسی لئے تو انہوں نے اپنے کمرے میں ماورا انرا کنڈیشنر لگوا دیا تھا۔

(میرے کمرے میں تو کوئی ایسی چیز لگوا دیجئے جو تمام شب آگ اگلتی رہے مگر دھواں کہیں نظر نہ آئے۔)

مگر دلاؤ ویزا کو ماورا سے کبھی حسد محسوس نہیں ہوا تھا! انجانے میں اس کا ہاتھ خود ہی کانٹوں جبری شاخ پر جا پکڑتا تھا! کانٹوں جبری شاخ ہاتھ میں پکڑنے سے ہاتھ بولہاں ہوتے ہیں۔ اس کو ہاتھوں پر لبو بہت پسند تھا۔

”واقعی تو حید۔“ اس نے مسکرا کر تو حید کی طرف دیکھا! بہت اچھا انرا کنڈیشنر ہے۔ میرا تو خیال ہے۔ تم بھی ایک اپنی میس کے لئے لے جاؤ۔“

تو حید ہنسنے لگا۔

آئی تھی۔ دلا ویز نے اپنے آنسو انگلیوں سے اڑائے اور پری کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اس طرح جیسے وہ صدیوں بدھی روح ہو۔ پری اس کی گود میں لیٹی رہی اور لمبے لمبے گرم سانس لیتی رہی بڑی دیر کے بعد دلا ویز نے اس کا سر اونچا کیا۔ اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ملائم لہجے میں بولی:

”میں پہلے تو حید سے بات کروں گی، پھر تیرے ابا سے۔“

”دل باجی۔“ پری اٹھ کر اس سے لپٹ گئی دل باجی آپ تو ماں کی طرح دل کی بات جان جاتی ہیں۔“ اس نے دلا ویز کے رخسار پر زور سے پیار کیا۔ اور بھاگ گئی۔ شدید اور جلتا ہوا پیار۔ جس کا لمس اس کے رخسار پر سلگتا رہ گیا۔ گزrے ہوئے سارے دنوں میں اور آنے والے سارے دنوں کے لئے اس کے پاس صرف یہی سلگتا ہوا پیار ہی اس کی سوغات تھا۔ عجیب طرح چٹھی تھی کہ قطب صاحب اٹھ کر اس کے سامنے آ بیٹھے۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”بڑی عجیب بات سوچ رہی ہوں۔“

”بھئی، ہمیں بھی بتاؤ ایسی کیا بات ہے؟“ قطب صاحب نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم چونک گئی پھر ہوش میں آ کر بولی:

”اچھی پری کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“

”پری کے بارے میں کیا عجیب بات ہوگئی ہے؟“ قطب صاحب تردد سے بولے۔ دلا ویز نے نے پہلے سنبھل کر قطب صاحب کی طرف دیکھا پھر مز کر پیچھے دیکھا کہ

کہیں پری تو وہاں نہیں کھڑی اپنے آپ کو پرسکون بنا کر بولی:

”عجیب بات نہیں اپنی دیکھتی ہی دیکھتے جوان ہوگئی ہے۔“

قطب صاحب ایک دم جھٹکے سے پیچھے ہو گئے۔

سے دیکھا کہ پری ایک دم لال ہوگئی۔ یوں دل کا سارا خون چہرے پر کب آتا ہے؟“

”پری تو کہاں گئی تھی؟“

دلا ویز نے سہمی ہوئی آواز میں جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

”چائے دینے گئی تھی۔“ وہ شرما کر بولی۔

”تو حید کو؟“

”جی۔۔۔۔۔!“

پری نے دوپٹے کا کونہ منہ میں ڈال کر کہا۔ تب دلا ویز کو یاد آیا پری نے ایک بار بھی اس کے سامنے تو حید کو انکل یا ماموں نہیں کہا تھا۔ جس طرح ولی سارا دن تو حید انکل تو حید انکل کہتا رہتا تھا۔

”پری ادھر آ۔۔۔۔۔“ دلا ویز نے پیالی اور کتاب ایک طرف رکھ دی۔ پری اس کے قریب آ گئی۔ بولی:

”بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔“ پری اس کے آگے فرش پر بیٹھ گئی دلا ویز نے اس کی آنکھوں میں

جھانکا۔۔۔۔۔ اور حیرت سے بولی:

پری تو اتنی بڑی ہوگئی ہے جان۔“

پری نے شرما کر سر جھکا لیا۔

پھر دلا ویز نے بے چینی سے پوچھا:

”تو حید تمہیں اچھا لگتا ہے؟“

جواب دینے کی بجائے پری نے اپنا سر دلا ویز کی گود میں رکھ دیا۔

دلا ویز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔۔۔۔۔ ماگ پری ماگ۔۔۔۔۔ میرے دل کا آخری

نکلا بھی ماگ۔۔۔۔۔ میری آخری پونجی بھی ماگ۔۔۔۔۔ کہ میں تو اس مگرمی میں سب کچھ لانے کو

”لڑکیاں اسی طرح بڑی ہو جاتی ہیں اس میں عجب کیا ہے؟“

”واہ۔ آپ باپ بن کر سوچ رہے ہیں ذرا ماں بن کر سوچئے۔۔۔ ابھی تو اسے جی

بھر کر پیار نہیں کیا کہ اس کے جانے کے دن آگئے ہیں۔“

دلا ویز نے جان بوجھ کر یہ ذکر چھپا رکھا ’قطب صاحب کے چہرے سے یوں محسوس ہوا

جیسے انہیں اس ذکر سے خاصی کوفت ہوئی ہے مگر انہیں ذہنی طور پر تیار کرنا بہت ضروری ہے۔

وہ بولے: ”دلا ویز! میں اس معاملے میں بالکل گمراہ ہوں۔ اچھا کیا تم نے مجھے یاد دلا

دیا اس کے لئے جو کچھ کرنا ہے تم نے کرنا ہے بس مجھے کبھی کبھی یاد بانی کراتی رہا کرو تا کہ

میں ذہنی طور پر اس سے بچھڑنے کے لئے تیار ہوں۔“

”ایک دن تو ایسا ہونا ہی ہے قطب صاحب! دلا ویز نے کہا۔

”اور کتنا اچھا ہے اس دن کے لئے تم میرے پاس موجود ہو اگر میں تنہا ہوتا تو کیا

کرتا۔۔۔؟“ قطب صاحب نے دیا ننداری سے اعتراف کیا۔

ابھی دلا ویز نے اس کے جواب میں کچھ کہا نہیں تھا کہ پری اندر سے بھاگتی ہوئی آئی

اور بولی:

”ابنی ابنی۔۔۔ دیکھیں۔۔۔ ولی نے میری گڑیوں کی گردنیں تو زدی ہیں۔“

”ولی۔۔۔“

قطب صاحب کی بجائے دلا ویز نے آواز لگائی ”میں گناہ تھا کہ بڑی بہن کو تنگ نہیں

کرتے۔۔۔ ولی کہیں چھپ گیا۔

قطب صاحب پری کی طرف دیکھ کر بولے: ”اب تم بڑی ہو گئی ہو پری! اپنی ساری

گڑیاں ولی کو دے دو۔ اس نے ان کے ساتھ جو سلوک کرنا ہو کرے۔“

”واہ۔۔۔ یہ اچھی ہدایت دی جا رہی ہے۔“ دلا ویز غصے سے بولی۔ ”پری کی گڑیاں

کوئی خراب نہیں کرے گا وہ اپنے پاس ہمیشہ سنبھال کر رکھے گی۔“

”دلا ویز! تم ولی کے ساتھ بڑی سختی کرتی ہو۔“ قطب صاحب نے کہا۔ ”آ خر لڑکا ہے

لڑکے تو شرارتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔“

”ابنی۔۔۔ ابنی۔۔۔ پری قطب صاحب کی کرسی کے بازو پر آ کر بیٹھ گئی اور بولی:

”آپ ہمیشہ دل باجی کو دلا ویز کہتے ہیں حالانکہ ان کے سب جاننے والے انہیں دل

ہی بلاتے ہیں۔ آپ دل کیوں نہیں بلاتے ابنی؟“

قطب صاحب مشکل میں پھنس گئے۔ جلدی سے پائپ منہ سے لگا لیا۔۔۔ تو دلا ویز

بولی:

”نہیں پری مجھے ان کا دلا ویز بلانا بڑا اچھا لگتا ہے۔۔۔ اور پھر میں ان کا دل تو ہوں

نہیں۔۔۔۔۔“

اس طنز کو قطب صاحب نے صاف محسوس کیا۔ مگر پری کی طرف دیکھ کر بولے:

”آج سے ہم اپنی جینی بات یاد رکھیں گے۔۔۔ اور دلا ویز کو دل بلانیں گے۔“

(اب نہیں قطب صاحب۔۔۔ اب وہ دل نہیں رہا جو ایسی بچکانہ باتوں پر بے قابو ہو

جا رہا تھا ’محبت اور شکرگزاری میں بڑا فرق ہوتا ہے۔۔۔ اب نہیں۔۔۔ اب وقت نہیں

رہا۔)

”میں ذرا خانہ سائے کو کھانے کا بتاتا آؤں۔“

یہ کہہ کر دلا ویز اندر چلی گئی۔

سارا دن اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھا اور سارا دن سوچتی رہی کہ توحید سے کس

طرح بات کرے گی ’دوپہر کیوں بھی توحید باہر چلا گیا تھا اور کھانے کے وقت تک نہیں آیا تھا۔

شام کو چار بجے وہ آیا تو بچوں کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلنے لگا اور بیٹھ کر دلا ویز نے ان

ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ کہنے لگی:

”تو حیدر تم آج جا رہے ہو۔؟“

”ہاں دل“ وہ بولا۔ ”تمہیں بتانا یا نہیں رہا۔“

”مگر ابھی تمہاری ایک ہفتے کی چھٹی باقی ہے۔“

”ہاں ہے تو مجھے چند دن پنڈی میں رہنا ہے۔ وہاں کچھ کام ہیں۔“

”مجھے بھی تم سے ایک ضروری کام تھا تو حیدر۔“

دلّا ویز نے نظریں جھکا کر کہا۔

”کہو میں ہر طرح حاضر ہوں۔“

”در اصل سمجھ نہیں آ رہی کہ کس طرح کہوں اور پھر میرے علاوہ تمہیں یہ بات کوئی اور

کہہ بھی نہیں سکتا ظاہر ہے مجھ سے زیادہ تمہارے قریب کون ہوگا؟ تمہارے امی ابو

سلامت نہیں، میری امی بھی ساتھ چھوڑ گئیں تو تمہاری شادی کا فرض مجھے ہی ادا کرنا پڑے

گا۔“

”تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

تو حیدر نے پلٹ کر یوں جواب دیا جیسے اس کے پاؤں پر پچھوٹے کاٹا ہو.....

”یہ میرا فرض ہے تو حیدر میں تمہاری شادی کر دوں، مجھ سے تمہاری اجازت زندگی نہیں

دیکھی جاتی۔“

”کس نے کہہ دیا ہے کہ میری زندگی اجاڑ ہے؟ میں تو ایک مطمئن زندگی گزار رہا

ہوں۔“

”لیکن جو لوگ مطمئن ہوتے ہیں، کیا وہ شادی نہیں کرتے۔“

”کر لیتے ہوں گے، کم از کم میں تو شادی کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔“

سب کو دیکھا۔ کتنی بے پروائی سے پری اس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ہر بار ٹٹل کاک کی بجائے اپنا دل اس طرف پھینک رہی تھی۔ دلّا ویز نے غور سے دیکھا۔ پری ان چند دنوں میں بے حد خوب صورت نکل آئی تھی اتنی خوب صورت کہ اس پر نگاہ ہی نہ نکلتی تھی واقعی پریوں کے دیس کی کوئی مخلوق کتنی ہی تب سے یاد آ سب کہتے ہیں۔ ”پری بالکل اپنی ماں پر ہے۔“

پری کو دیکھا تو پہلی بار اسے پری کی ماں سے حسد محسوس ہوا..... آخر وہ اتنی خوب صورت کیوں تھی، کہ اس کے بعد قطب صاحب کے دل میں کوئی رہ ہی نہ سکا..... ولی تو حیدر کے کندھوں پر بیٹھا ریٹ چلا رہا تھا..... اور تو حیدر بچوں کے انداز میں بھاگ بھاگ کر پری کو بھگا رہا تھا۔ دلّا ویز زیادہ دیر یہ منظر نہ دیکھ سکی۔ اٹھ کر می کھڑی گئی۔ اپنے کمرے میں گئی تو تو حیدر کا ردی سامان پیک کر رہا تھا..... اس نے پوچھا تو وہ بولا:

”سیمر صاحب کا حکم ہے رات کی گاڑی سے جانا ہے۔“

حالانکہ اسے معلوم تھا ابھی تو حیدر کی ایک ہفتے کی چھٹی باقی تھی۔ تو حیدر ایک دم کیوں تیار ہو گیا۔ وہ باہر نکل آئی اور دوسرے پری کو آواز دی اسے قریب بلا کر بولی:

”اب کھیل بند کرو۔ مجھے تو حیدر سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اور دیکھو چائے وہاں

پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی ہوگی..... جاؤ تو حیدر کے لئے گرم چائے بنا کر لاؤ۔ اور ولی کو بھی اپنے

ساتھ اندر لے جاؤ۔“

پری جانتی تھی دلّا ویز کون سی بات کرنے والی ہے اس لئے ولی کو لے کر اندر چلی گئی وہ

تو حیدر کو لے کر لان کے اس کونے میں چلی گئی جہاں چائے پڑی ہوئی تھی۔

”چائے پیو گے تو حیدر تمہارے لئے بناؤں۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں ضرور بناؤ۔“

دلّا ویز نے چائے بنا کر تو حیدر کے آگے رکھ دی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ چائے

تو حیدر ضد نہ کرو۔ میں تم سے بہت واقف ہوں پر اپنی باتوں کو بھول جاؤ مگر پر کسی کا زور نہیں ہوتا۔، کچھ پر کتنی اچھی اور کتنی پیاری لڑکی ہے۔ میں نے اس کی تربیت کی ہے۔ یہ تمہیں بے حد پیار دے گی اور.....

”مجھے ایسی لڑکیوں سے نفرت ہے۔“ تو حیدر ایک دم بھر گیا۔ اس کے اندر سے وہی پرانا اور غصیلہ مرد نکل آیا۔ ”ایسی عورتوں پر انتہا کتنی بھگتا ہوں۔“ وہ بولا۔

یہ کہنے کے بعد فوراً اس نے اپنا غصہ خنکوں میں دبا نے کی کوشش کی آواز جیسی کر لی۔ گویا اس پر ضبط کا پل بنالیا تاکہ اس پل پر چل کر یوں بات کر سکے جس طرح وہ زندگی گزار رہا تھا۔

دلّا ویز پہلے تو اپنی قمیض کا کونہ مروڑتی رہی پھر نظریں اٹھا کے اس کے چہرے پر گاز دیں۔ غصے میں تاتاؤ و کتنا اچھا لگ رہا تھا آخر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیوں نہیں دیکھ سکتی ؟؟ اس نے دل میں سوچا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”عورت اپنے آپ کو تاریخ کا ایک حصہ بنانا چاہتی ہے۔ اپنی زندگی کو کسی سنبھ سے کارنامے سے مزین کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے بہت شکن بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص اور سچے مرد کے ذہن میں رکھنا ہوا محبت کا بت پاش پاش کر دیتی ہے۔ بتوں کو پاش پاش کرنے کے بعد غار تھپتھپا عورتوں کے پاس بوتے ہیں اس میدان میں مرد بچا رہا نہتا ہے۔ بس اس کے دل میں تو اتنی جلد ہوتی ہے کہ ایک بار وہ اس میں ایک بت بٹھا لیتا ہے۔ وہ اپنی مصروف اور ابھی ہوئی زندگی میں ہر رات اس بت پر بار توڑ چاھا کرتا ہے اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ یہ دیکر چپ چاپ اور دھیمی دھیمی عورت ایک غیر محسوس طریقے سے اس کے ارد گرد ایک آگ سی روشن کر دیتی ہے ایسی آگ جس میں مرد کی یادداشت گم ہونا شروع ہو جائے اور محبت کا پرانا بت پھٹنے لگے۔ حتیٰ کہ ایک دن ایسا آ جائے جب اس

بت کا ہر عضو پھل کر اپنی اصل صورت نکھو دے اور مرد کو پوچھ بھی یاد نہ رہے۔ پھر یہ عورت اس شخص اس پر بیٹھ جائے۔ فاتح بن جائے۔ تھپتھپا پھل لھائے۔ مسخر کر کے مرد کو اپنی ٹھنی میں بند کر لے۔ فتح کے شادیانے بنائے اور سوچے کہ اس کی کتنی بڑی جیت ہوئی ہے۔

مگر جیت کس پر.....؟

یہ اس کم جیت نے بھی سوچا ہی نہیں۔

اپنی ہی صنف کو ڈھانا توڑنا اس کا نشان سنانا اور پھر اپنی سچ جھانا یہ صرف عورتوں کا وسیلہ ہو سکتا ہے عورتیں جو بچاری مظلوم ہوتی ہیں۔ تنم زدہ ہوتی ہیں مردوں کی ستائی ہوئی ہوتی ہیں۔ حالات کی ماری ہوئی عورتیں..... عورتیں..... عورتیں..... بچاری عورتیں.....

غصے کی ایک لہر پھر بھی پھر اس کے گھٹنے پھڑکے..... مگر اس نے چائے کی ٹھنڈی پیالی منہ سے اگلی۔ اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ دلّا ویز دیکھ رہی تھی کہ چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ مگر اس نے حسب عادت نئی پیالی نہیں بنائی۔ وہ جان گئی تھی کہ تو حیدر عرصہ دراز سے ٹھنڈی چائے پی رہا ہے۔ اس طرح غصہ دبا دبا کے..... گھونٹ..... گھونٹ..... زہر..... زہر..... محبت کے کبیر یہ زندگی ٹھنڈی برف چائے ہی تو ہے!

دلّا ویز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسے آنسو جو دریا بن جانے کو تیار ہو جاتے ہیں..... جس دن سے یہ ستر گم آ رہا تھا..... دو آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے نگاہیں اور بھی جھکا لیں۔ اور گھاس کی طرف دیکھنے لگی مومن کی وجہ سے گھاس کا رنگ اڑاڑ سا تھا۔ پتہ نہیں کس طرح اس کا ایک ایک آنسو اس زرد بد رنگ گھاس پر گرنے لگا۔ جیسے اس مردہ گھاس کو سبز ہوا ہوا کرنا چاہتا ہو۔

”لیکن ان بت شکن عورتوں کو کیا مل جاتا ہے زندگی میں.....“ تو حیدر نے پیالی خالی کر کے واپس رکھ دی۔

وہ کھڑا ہو گیا۔

دو قدم چل کر گیا۔ پھر واپس آ گیا۔

اور پاؤں گھاس پر بیچ کر بولا:

”مجھے بت شکن عورتوں سے نفرت ہے‘ شدید نفرت.....“ یہ کہہ کر تیز قدموں سے

چلتا اپنے کمرے میں غائب ہو گیا۔ دلا ویز نے لگا ہاتھ کے اسے جاتے ہوئے دیکھا‘ پھر

اپنے اداس گھر کی طرف دیکھا۔ پری گرم چائے کا ٹرے پکڑے گم صم سی چند قدموں کے

فاصلے پر جانے کب سے کھڑی تھی۔

”خوب اچھے کپڑے پہنتی ہیں‘ بن ٹھن کر رہتی ہیں‘ بچے بھی پیدا کرتی ہیں۔ شوہر کی رجسٹری اپنے نام کر دالیتی ہیں مگر کیا اس ٹولنے ہوئے بت کی جگہ کھڑی ہو سکتی ہیں؟ کیا ان پر ہر رات شوہر پھول چڑھاتے ہیں ضروری نہیں کہ ہر مفتوحہ علاقہ زندگی کی خوشی کا باعث ہو..... بادشاہ علاقے فتح کرتے ہیں..... اور چھوڑ کر چل دیتے ہیں..... مفتوحہ علاقوں میں کس کو سکون ملا ہے؟ مفتوحہ علاقہ میں پامال ہونے والوں کی آہیں اور کراہیں نکھری رہتی ہیں“ تمام عمر یہ عورتیں اس ایک رات کو ترستی ہیں۔ جوان کو سہاگن کر جائے‘ مگر پھر بھی فاتح جرنیل کی طرح ساری زندگی بسر کر دیتی ہیں‘ تن میں روح بیشک نہ ہو۔ مگر عالیشان وردی کا غرور ضرور ہوا اور اب.....“

وہ دم لینے رکا‘ پھر دلا ویز کے روتے ہوئے چہرے پر بہتا ہوا بے رنگ پانی دیکھ کر

بولا۔

”اب یہ تمنہ پری اپنے کا نہھے پر سجانا چاہتی ہے۔ اب وہ تمہارا عمل دہرانا چاہتی ہے۔ اب وہ جوانی‘ حسن اور محبت کی فوجیں لے کر نکلی ہے‘ اب وہ میرے ارد گرد اپنے حسن سلوک کی خندق کھودنا چاہتی ہے۔ اب وہ میرے بے سکون قلعے کا محاصرہ اپنی شب و روز کی خدمت گزاری سے کرنا چاہتی ہے.....“

”اب اس کے ہاتھ میں موقعے کا بہت بڑا پیشہ ہے اور اب وہ آخری ضرب لگانے

والی ہے۔“

”اور تم.....“ اس نے ہونٹ بھیجنے اور غرا کر بولا:

”اور تم یہ سب بھانپ کر مجھے ہتھیار بھیجنے کی ترغیب دینے آئی ہو۔ اپنا علاقہ خود اپنے دشمن کو دینا چاہتی ہو ایک اور بھنڈا اپنے سر پر سجانا چاہتی ہو اور سمجھتی ہو میں ان جھکندوں سے واقف نہیں ہوں۔“

شرعی

تو عام بچیوں کی طرح شرمیلی بھی بڑوں سے نہ سی اپنی عمر کی سہیلیوں کے ساتھ ضرور گھل مل جائے گی۔ البتہ اماں جان کا رویہ اس کے ساتھ جداگانہ تھا۔ لوگوں کے اعتراضات پر وہ سخت پاتو نہیں ہوتی تھیں مگر انہیں شرمیلی کے اس بچگانہ یا دوسرے لفظوں میں احمقانہ رویے پر اعتراض بھی نہ تھا۔

بھئی شرم و حیا تو لڑکی کا زیور ہے۔ آج کل کی بے حجاب اور نڈر لڑکیاں اماں جان کو پسند نہیں تھیں۔ بے ڈھنگے کپڑے پہنتیں بے ہودہ بال بنا تھیں اور مردانہ وار دندناتی پھرتیں۔ بڑوں سے یوں مخاطب ہوتیں جیسے ان کے ہم عصر ہوں اور والدین کو بالکل دوست سمجھتیں اور آج کل کے والدین بھی ان کی نگاہ میں بودے تھے۔

اب شرمیلی کی بیبی بہت سی کیا کم تھی کہ لڑکیوں ہی میں ماں باپ چھوڑ گئے تھے اور وہ اماں جان کی جھولی میں آگری تھی۔ اماں جان جو گھر میں کسی کی داوی تھیں کسی کی نانی کسی کی چچی اور کسی کی پھوپھیوں۔ مگر سب ہی انہیں اماں جان کہتے تھے۔ اصل رشتے سے کوئی نہیں بلاتا تھا۔ شرمیلی ان کی نواسی تھی۔ تھیں تو وہ بھی کے لیے بہت مشفق۔ مگر شرمیلی چونکہ کچے پھل کی مانند ان کی گود میں آگری تھی اس لیے وہ ان کی خصوصی توجہ اور محبت کی حقدار بن گئی۔ یوں اماں جان خود دمر کے اس دور میں بھی خوب توانا اور چاق و چوبند تھیں۔ پہننے اوڑھنے کا شوق بھی ابھی مانند ہوا تھا اس لیے اپنی بہوؤں اور بیٹیوں سے کہیں بہتر دکھائی دیتی تھیں۔ شرمیلی کی اٹھان انہوں نے اپنی مرضی پر کی تھی۔ نواسیاں اور پوتیاں کب ان کی منی تھیں۔ ان کی نصیحتوں کو بے وقت کی راغبی کہتیں اور جب زیادہ عاجز آتیں تو جبرائیل گپ کا ایسا چپت رسید کرتیں کہ اماں بی اپنا منہ بہلائی رہ جاتیں۔ لے دے کے ایک شرمیلی گدی تھی جس کو اب میٹھا برس لگا تھا اور اس سال اس نے میٹرک بھی پاس کر لیا تھا۔ اماں جان کے نزدیک مانو وہ ابھی دودھ چیت پی رہی تھی کیونکہ ہر کام اماں جان سے پوچھ کر کرتی۔

جسے عرف عام میں شرم و حیا کی پتلی کہتے ہیں تا؟ ایسی تھی وہ۔ نام تو اس کا شریفہ خانم تھا۔ مگر وہ اپنے نام کی مناسبت سے کچھ زیادہ ہی باحیا اور باحجاب نکلی۔ یوں خاندان بھر میں شریفہ کی بجائے شرمیلی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ مرد تو کیا وہ عورتوں کا سامنا بھی نہ کر سکتی۔ گھر میں جو کبھی رشتے کی چچیاں ممانیاں پھوپھیوں یا خالائیں آتیں تو شرمیلی کی ڈھونڈ یا چچی۔ جانے کب کس وقت ملی کے بچے کی مانند کھسک جاتی اور پھر کسی بند کمرے کے کونے میں منہ چھپائے مل جاتی۔ یتیم و سیر پچی تھی۔ سب ہی اس کے سر پر دست شفقت پھیرنا چاہتے۔ بلا بادر پاس بٹھانا چاہتے۔ اس کی ولداری کرنا چاہتے۔ مگر وہ تو کسی کے سامنے آنے پر آمادہ ہی نہ ہوتی تھی اور جواز بردستی پکڑ کر لایا جاتا تو گرجوں سے چہرہ جدا نہ کرتی۔ کبھی آنچل میں منہ چھپائے جاتی۔ جو کبھی اماں جان کی ڈانٹ پکڑ کھا کر کسی کو سلام کرنے آ جاتی تو ہاتھ جیر ٹھنڈے پڑ جاتے۔ چھوٹی سی ناک بالکل سفید پڑ جاتی اور اس پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگتے۔ کوئی بات کرتا تو چہرہ کئی رنگ بدلنے لگتا۔ گھبراہٹ یوں طاری رہتی جیسے ریل کی چوڑی عبور کر رہی ہو۔ منہ سے کوئی فقرہ صحیح سلامت ادا نہ ہوتا اور چہرہ تو اس نے جب بھر کے کسی کا دیکھا ہی نہ تھا۔

سب کا خیال تھا کہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ بے جا شرم و حیا یا احساس کمتری دور ہو جائے گا

شرمیلی بی دوپٹے کی بھل میں منہ پھپھائے پسینہ ہوئی اماں جان کے کمرے میں گھس جاتی۔
خاندان بھر میں اس کا یہ بھی مذاق بنا ہوا تھا کہ اگر شرمیلی کو کسی محفل سے بھگانا ہو تو کسی بھی
لڑکے کو اندر بلا لیں شرمیلی بیگم یوں بھاگے گی جیسے کو اٹھیل سے اڑتا ہے۔

پر اماں جان کو تو اس کی اس عادت پر بھی فخر تھا اور وہ بڑے غرور سے کہتیں۔ ”میری
شرمیلی کو تو یہ بھی پسند نہیں کہ گھر میں مرد نوکر رکھے جائیں۔“ چونکہ باورچی خانے میں
خاناں اس کام کرتا تھا۔ اس لیے وہ کبھی باورچی خانے میں نہیں جاتی تھی۔ گھر کی بھاری پونچھ
کے لیے جو بارہ سال کا لڑکا رکھا ہوا تھا وہ بھی شرمیلی کو کھلتا تھا۔ اس لیے اماں جان نے جلد ہی
ایک عورت کا ہندو بست کر لیا تھا۔ ایسی خاندن نشین بچیاں فی زمانہ نایاب تھیں۔

اس لیے اماں جان اسے کسی ناقد رے کے پر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جب شرمیلی نے
میٹرک پاس کر لیا تو اماں جان نے سال بھر اسے اپنے گھٹنے کے ساتھ بٹھائے رکھا۔ بہتیرا
سکھوں نے کہا کالج میں داخلہ تو دلوا دو جب اچھا جوڑ مل جائے گا تو اٹھوا لینا۔ مگر اماں جان
اسے کالج کی کواہنیں لگنے دینا چاہتی تھیں۔ بہت دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر اماں جان نے
اسے اویس کے پردہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اویس رشتے میں اماں جان کا پوتا لگتا تھا۔ اس کے تعلیمی اخراجات سب اماں جان نے
اٹھائے تھے۔ اس کی ماں کو اس کے باپ نے طلاق دے دی تھی۔ اس لیے ماں نے کہیں اور
بیہ رچا لیا اور باپ دوسری شادی کر کے مطمئن ہو گیا۔ تب رلتا کھلتا اویس اماں جان کی نگاہ
کرم کے سائے میں آ گیا۔

اویس بھی اماں جان کا چہیتا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد ایک دو انیوں کی کمپنی میں
میڈیکل ریب ہو گیا تھا۔ بقول اماں جان بہت ہی ہونہار بچہ تھا۔ اماں جان کے فیصلے کے
آگے کسی کو دم مارنے کی جرات نہ ہوئی۔ سو بیہ پکا ہو گیا۔ اویس کو انہوں نے بتا دیا تھا کہ بچی

اماں جان نہالوں.....!

اماں جان نیا غرارہ پہن لوں.....!

اماں جان بال کیسے بناؤں.....!

سکول جاتے وقت اماں جان کو سلام کر کے جاتی اور واپس سیدھی ان کے کمرے میں آ
جاتی۔ کپڑے بدل کر وہیں ان کے تخت پر بیٹھ جاتی۔ اگر گہائیوں کی کوئی کتاب یا کوئی مذہبی
کتاب اماں جان مناسب سمجھتیں تو اسے پڑھنے کو دیتیں۔ ورنہ وہ سوئی دھاگہ لے کر
بیٹھ جاتی اور اماں جان پاس بیٹھی کبھی دنیا کی بے ثباتی پر اور کبھی زمانے کی اونچ نیچ پر اسے لکچر
پلائے جاتیں۔ کبھی کبھار جو اس کی کوئی کزن اسے بلائے آتی تو وہ خود ہی اس کے ساتھ
جانے سے انکار کر دیتی۔ اماں جان لاکھ کہتیں۔ ”جاؤ بیٹی تم بھی ذرا ان کے ساتھ ہنس بول
آؤ۔“ مگر وہ نہ نہ کیے جاتی۔

جب اس کی کرن اسے چلی کئی سنا کر چلی جاتی تو اماں جان جی ہی جی میں خوش ہو
جاتیں۔ وہ کب چاہتی تھیں کہ شرمیلی ایک ہل کے لیے بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو یا ان
ماڈرن بچیوں کے ساتھ کھیل کود کرنا اپنا اخلاق خراب کرے۔ وہ اس کے نہ جانے پر فخر ہونے
کی بجائے اسے دلارتیں چمکا رہی تھیں اور ایک مثالی بچی کے ساتھ تشبیہ دیتیں۔

البتہ اس کی باقی کزنز اسے بدھی روح..... اماں جان کا سایہ..... سردار اور پور خانم کبھی
تھیں۔ وہ سب کی باتیں چپ چپ سن لیتی اور پھر اماں جان سے آکر شکایتیں لگاتی۔

”ممبر کر دی ہیں ان بے حیا لڑکیوں کی باتوں کا خیال نہ کرو۔ ان کا انجام کسی روز تمہارے
سامنے آ جائے گا۔“

اماں جان اسے دلا سے دیتیں۔ جب وہ اپنی رشتہ دار بہنوں سے گھل مل نہیں سکتی تھی تو
پھر بھلا رشتے کے بھائیوں کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔ ادھر کوئی کزن گھر میں داخل ہوا ادھر

تین ماہ کے بعد کھولا جانا تھا۔ گھر پر بھی شرمیلی سارا وقت اس کی تیمارداری میں لگی رہتی۔ اب گھر میں اس کے سوا کون تھا۔ ہسپتال میں تو نرسیں ہاتھ بٹاتی تھیں۔ مگر یہاں سب کچھ اسے خود کرتا پڑتا۔ اماں جان بھی دن کے وقت آ جاتی تھیں۔ مگر رات کو واپس اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔ یہ تھا سالیٹ اماں جان نے خود انہیں کرائے پر لے کر دیا تھا ورنہ اوہیں کی تنخواہ اتنی کہاں تھی کہ اسے الگ رکھ سکتا۔ اماں جان کا خیال تھا کہ شادی کے بعد دولہا اور دلہن کو سب عزیزوں سے الگ تھک رہنا چاہیے۔ اماں جان کو یہ بھی یقین تھا کہ اوہیں کی دونوں نانگیں اللہ کے فضل سے ٹھیک ہو جائیں گی اور وہ ہمیشہ جاتے ہوئے شرمیلی کو نصیحت کر کے جاتیں کہ وہ جی جان سے اپنے شوہر کی خدمت کرے۔ اسی میں اس کی بہتری ہے۔

ایک زندگی کی شامیں انتہائی بوجھل اور سگوار ہو گئی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ دونوں اتنی اداس شام اور اتنی لمبی رات کیسے بسر کریں۔ اوہیں خود چار پائی پر پڑا پڑا تھک گیا تھا۔ مگر وہ اپنی مرضی سے کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ کبھی کوئی کتاب پڑھنے لگتا۔ کبھی تصویریں دیکھنے لگتا یا پھر شرمیلی کو پاس بٹھا کر لالچنی سے سوال کرنے لگتا۔ شرمیلی کو کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ سوئی سلائی سے بھی آکٹا چکی تھی اور اوہیں کو وہ بہت بے زار اور بکھری بکھری نظر آتی۔ وہ اپنے طور پر اپنی معذوری پر معذرت خواہ بنا رہا مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔

ایک روز جب اماں جان انہیں تو اس نے بڑی لبا جت سے انہیں کہا کہ وہ ان کو ایک ٹی وی لے دیں۔ کم از کم شرمیلی کو تو گر رہا یا کرے۔ اماں جان پہلو تو بھڑک اٹھیں۔ گھر میں کنبھر خاندانہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ ٹی وی چل رہا ہو تو کسی کو گھبراہٹ ہو ش نہیں رہتا۔ شام کو ہر شخص اپنا بیج بن کر بیٹھ رہتا ہے اور شرمیلی کو تو کھانا پینے میں بھی ٹی وی دیکھنے کا شوق نہیں تھا۔ کتنا اچھا ڈرامہ یا فلم چل رہی ہوتی سب بلائے آتے۔ مگر وہ اماں جان کے بستر میں گھسی بیٹھی رہتی۔ اسے ان خرافات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور جب ڈرامے میں جوان لڑکے لڑکیاں ایک

ذرا شرم و حیاء والی ہے اس لیے اسے زمانے کے ساتھ چلانے کی کوشش نہ کرے۔ ایسی لڑکیاں بہت اچھی اور طاعت شعار بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔

اوہیں کے لیے شرمیلی کے ارد گرد رہنے ہوئے شرم و حیاء کے رواجی جال کو توڑنا ناممکن سا بن گیا تھا۔ مگر وہ اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ جانتا تھا چنی ہے۔ برد بار بننے اور شعور حاصل کرنے میں دیر لگے گی۔ رفتہ رفتہ جب اس میں ذہنی پختگی آئے گی تو وہ اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے گا۔

ابھی شادی کو چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا کہ عجب افتاد پڑی۔ اوہیں کا اسکوٹر ایک تیز رفتار بس کی زد میں آ گیا۔ اوہیں شدید زخمی ہوا۔ صرف یہی نہیں اس کی دونوں نانگیں بھی ٹوٹ گئیں۔ چھوٹی سی شرمیلی..... اس حادثے پر حواس باختہ ہو گئی۔ ابھی تو وہ اپنے اوہیں سے اچھی طرح کھل مل نہ سکی تھی۔ جو جی میں باتیں تھیں وہ بے تکلفی سے نہیں کہہ پائی تھی کہ وہ منہ بند کر کے چپ چاپ چار پائی پر آ رہا۔

زندگی تھی جو وہ بچ گیا۔ مگر ناگوں کی بات ڈاکٹر کچھ ڈھوک کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ انہوں نے ناگوں کے بے شمار انکسے لیے اور پھر ناگوں پر پلستر چڑھا دیے تھے۔ جب تک پلستر نہ اتارتا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ آیا اس کی نانگیں پہلے کی طرح کام کر سکیں گی یا اسے بے سہاکیوں کا سہارا لینا پڑ جائے گا۔

شرمیلی دن رات اوہیں کی بیٹی سے لگی بیٹھی رہتی۔ رات رات بھر نمازیں پڑھ پڑھ کر اس کی تسکین کے لیے اللہ سے دعائیں مانگتی۔ رورو کر اس نے اپنی آنکھیں خراب کر لی تھیں۔

ایک مہینے کے بعد جب اس کے باقی زخم منڈل ہو گئے تو ڈاکٹر نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس صورت میں کہ اس کی دونوں ناگوں پر پلستر چڑھا ہوا تھا اور یہ پلستر

دیکھیں گے۔“

روزانہ شام کو شرمیلی کو کام ختم کرنے کی جلدی ہوتی۔ اماں جان نے شام کو آنا داندستہ ہی بند کر دیا تھا۔ مگر انہیں اب کسی کا انتظار بھی نہیں ہوتا تھا۔ یکا یک شرمیلی کو محسوس ہوا کہ سب پروگراموں سے زیادہ اشتہاروں کو ذوق و شوق سے دیکھتی ہے۔ چائے کے اشتہار سگریٹ کے اشتہار ٹخنڈی بوتلوں کے اشتہار صابونوں کے اشتہار آف انڈو تو ان اشتہاری پرویوں کو دیکھ دیکھ کر دنگ ہوتی رہتی۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین لگتی۔ ایک سے ایک بڑھ کر دیدہ زیب اور خوشنما لباس میں نظر آتی۔ کتنی طمانیت اور نکھار ہوتا ان کے چہروں پر۔ ایسے معلوم دیتا جیسے یہ ازل سے خوش رہنے اور خوش کرنے کو پیدا ہوئی ہیں۔ دنیاوی نعمتوں کے درآن کے لیے کھلے ہیں اور کس طرح مردان کی راہوں میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ کہیں تو وہ ان کے کندھوں پر سوار تھکی کی طرح اڑتی نظر آتیں۔ کہیں کوئی نوجوان لڑکا کسی مستانی حسینہ کی آنکھوں میں ڈوبتا ہوا چلا جاتا۔ کہیں محفل کی محفل اس کے حسنِ قد و سامان پر فریفتہ۔ شادو کے تلے جھاگ میں چلتی ہوئی لڑکی جب شرمیلی کو نظر آتی تو اس کے دل میں گلدستی سی ہونے لگتی۔ جیسے شادو کی زم زم نرم ہوا اور خداس کے جسم پر گر کر اس کے جذبات کو چھیر رہی ہے۔ پھر جب وہ اس حسینہ کو دیکھتی جو اپنے خوبصورت نرم منہائی ہاتھوں سے اپنے ساتھی کے رخسار چھو لیتی تو اس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ اسی دوران اس پر انکشاف ہوا کہ تنہائی کی زندگی ایک عذاب سے کم نہیں۔ اس دنیا میں مرد اور عورت کو لازم و ملزوم ہیں۔ پھر وہ صبح اٹھ کر آٹنے میں اپنے خوب صورت چہرے کو دیکھتی۔ وہ ان اشتہاری لڑکیوں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ پر یہ وہ چاند تھا جس نے سات پردوں میں چھپ کر رہنا تھا۔ کیونکہ اسے روشنی بکھیرنے کی اجازت تھی۔ اس عمر میں اماں نے اس کی شادی کر دی تھی اور شادی کے چھ ماہ بعد اس کا شوہر اپانچ ہوا چار پائی پر پڑا تھا۔ وہ لینے ہوئے اولیس کو غور سے دیکھتی زرد سا

دوسرے سے بے حجابانہ گفتگو کرتے تو اسے پسند آ جاتا کبھی بکھار کر سے گزرتے ہوئے اس نے کچھ مین دیکھ لیے تھے اور اماں جان کے آگے جا کر تائب ہوئی تھی کہ پھر کبھی نہ دیکھے گی۔ مگر جب اولیس نے اپنی مجبوریاں بتائیں۔ اپنی بیماری کا واسطہ دیا اور اماں جان کو سمجھایا کہ شرمیلی اب شادی شدہ عورت ہے اور میری معیت میں بیٹھ کر بیوی دیکھے گی تو اماں جان مان گئیں۔ اگلے دن ان کے ہاں ٹی وی سیٹ آ گیا۔

اور اولیس کو یوں محسوس ہوا اس نے گھر میں ٹی وی سیٹ لگا کر بہت تعجب کی کی ہے۔ شام ہی سے دونوں پروگرام دیکھنے کو تیار ہو جاتے وہیں اولیس کے بیڈروم میں انہوں نے ٹی وی رکھ لیا تھا۔ ویسے تو شرمیلی بھی اسی کمرے میں سوئی تھی۔ مگر اس نے اپنے لیے وہاں ایک الگ چلنگ ڈالوایا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر انہیں سارے پروگرام اذہر ہو گئے۔ سلسلہ وار پروگرام کا وہ بڑی شدت سے انتظار کرتے۔ مزاحیہ پروگراموں کے اوقات خصوصیات سے یاد رکھتے۔ ذہنی آزمائش کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ شرطیں لگا کر جواب دیتے اور تو اور شرمیلی انگریزی فلمیں بھی بڑے شوق سے دیکھنے لگ گئی تھی۔ شروع شروع میں اسے سمجھنے میں بہت دقت ہوتی تھی۔ مگر اولیس جلدی سے اسے فلم کا خاکہ بتا دیتا۔ یا کوئی مشکل کی پچوائش آتی تو فوراً ساتھ ساتھ سمجھا جاتا۔ اس طرح ساری فلم اس کی سمجھ میں آ جاتی اور اس کو بھی دماغ لڑانے میں بہت لطف آتا وہ کبھی پھیلکی ماتم میں ڈوب جاتی شامیں خود بخود دسورے لگ گئی تھیں۔ شروع شروع میں وہ رشتیوں سے، قہقروں سے ایک عرصہ بعد اولیس نے شرمیلی کے چہرے پر مسکراہٹیں دیکھی تھیں اور وہ آپ اپنا دکھ بھی بھول گیا تھا۔

”جناب جلدی جلدی کھانا کھا لیں۔ ابھی فلاں پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ پھر مجھے اٹھائیے گا نہیں۔“ یالاہیے میں آپ کو سینک کر دوں۔ پھر اطمینان سے بستر میں بیٹھ کر فلم

یوں کام چلے گا۔ اگر اماں جان اعتراض نہ کریں تو وہ بھی..... اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ بھی پریوں کی طرح ان فضاؤں میں اڑتی پھرے۔ پہلی کا پڑ، بوائی جہاز دو گھوڑے والی گھیاں اچھے اچھے ماڈرن ملبوسات، کاش کبھی وہ بھی یوں تیرتی مسکراتی دلوں میں آگ لگاتی، سکرین پر آئے۔

بروز رات کو وہ سوئے میں ایسے ہی خواب دیکھتی کہ دو جوان اور خوبصورت بازوؤں میں وہ جھول رہی ہے اور وہ شوخ و شنگ آنکھیں اس کی آنکھوں میں اتر کر اس کے جسم میں نشے کی لہریں دوڑا رہی ہیں اور جب اس کی آنکھ کھلتی تو اسے جھرجھری آ جاتی۔ تو بہ تو بہ وہ کیسے ناممکن سے خواب دیکھنے لگی ہے۔ کیسی کبھی انجانی خواہشیں اس کے من میں جاگ اٹھی ہیں اور یک لخت چلتے چلتے زندگی ساکت ہو گئی۔

کاش وہ لوگ ٹی وی نہ خریدتے۔

اکثر وہ پروگرام دیکھے بغیر کروٹ بدل کر سو جاتی۔ تب اوپس اسے پیارے پکارے جلا جاتا۔ اسے بتاتا کہ اب ٹی وی پر کیا ہو رہا ہے کیا ہونے والا ہے۔ مگر جی جی میں وہ اس بات کا غصہ کرتی رہتی۔ کبھی صرف باتوں سے بھی زندگی گزری ہے۔ سوائے میٹھی باتیں کرنے کے یہ اب اور کبھی کیا سکتا ہے۔

اس کشمکش میں تین مہینے گزر گئے۔ پلستر کھلنے کا سب کو بے چینی سے انتظار تھا اور اس نے تو اللہ سے بے شمار دعائیں مانگ ڈالی تھیں کہ اب اوپس ٹھیک ہو کر چلے پھرنے کے قابل ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے محدودے تھک گئی تھی اور اپنی سوچوں سے اسے خود ہی ڈر لگنے لگا تھا۔

ایک ٹانگ تو بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ مگر دوسری کی ہڈی ہی غلط جڑ گئی تھی۔ اس کو تو ذکر پھر وہ بارہ جوڑنا تھا۔ پھر پلستر چڑھنا تھا۔ پھر کرب و اذیت میں اتنا عرصہ گزارنا تھا۔ تب جا

کمزور سا مانگوں پر پٹیاں چڑھائے جانے کیسے سارا دن چپ چاپ سالیٹا رہتا۔ اپنا کوئی کام اپنے ہاتھوں سے نہیں کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ہفتے میں ایک بار اسے اس کی شیبہ بھی بنانی پڑتی، اسے اس کام سے اتنی گھن آتی کہ بتانا نہ سکتی۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔ اس پر اماں کی نصیحتیں جینا دو بھر کیے دے رہی تھیں۔

جانے یہ کب ٹھیک ہوگا، کب چلنے پھرنے کے قابل ہوگا، دوبارہ اپنی مانگوں پر چل پھر بھی سکے گا یا نہیں۔ ابھی تک تو ڈاکٹروں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اگر یہ چار پائی سے نہ اٹھ سکے، تو..... تو..... افوہ! اسے جھرجھری سی آ جاتی۔ ایک شریف زادی کی مانند اسے ساری زندگی اس لاش کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔ تو زندگی میں کیا رہ جائے گا۔ پہل صراط پر چلنا ہوگا۔ ایک نوخیز جوان لڑکی کے ساتھ کتنی زیادتی ہے۔

دنیا میں ہر شخص آزاد ہے خوش ہے۔ مگر اسے جیسے پرکات کر پیچھے میں ڈال دیا گیا ہے۔

ماڈلنگ بھی ایک پیشہ ہے شفو..... ہمارے ملک میں ابھی شروع ہوا ہے۔ اس لیے لوگ اسے معیوب سمجھتے ہیں۔ ورنہ براپیشہ نہیں اس طرح لڑکیاں اچھی خاصی رقم کماتی ہیں اور ان کی تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ شروع شروع میں اوپس اسے ان اشتہاروں کو حیرت سے دیکھ کر سمجھایا کرتا تھا۔ ”یہ ماڈل گرلز ہوتی ہیں۔ آسمان سے نہیں اترتیں تمہاری طرح کی لڑکیاں، کالجوں میں پڑھنے والی، اچھے اچھے لوگوں کی بیٹیاں لیکن والدین ان کی پرورش اس طرح کرتے ہیں کہ یہ کسی بات کو برا نہیں سمجھتیں۔“

ہم نے آخر کیا تصور کیا کہ ہر بات میں ہمارے لیے اچھائی اور برائی کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ رات کو لیٹے لیٹے شرمیلی اکثر سوچا کرتی۔ اس میں آخر کیا کمی ہے۔ وہ دنیا میں کیا نہیں کر سکتی۔ شو بہرہ ستر پر پڑا ہے۔ پیسے کے لیے وہ دوسروں کے محتاج ہیں۔ آخر کب تک

گھر بٹھا لیا تھا اور اب اولیس یہ دھڑی غلطی کرنے جا رہا تھا۔ جگرے کا پتھی تو بس بچرے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کو قوت پرواز نہیں بخشی چاہیے۔ یہ اماں جان کا خیال تھا۔ پروہ بار بار اسے کہتیں۔

”پگلے تیری خدمت کون کرے گا۔ گھر کی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اس کی ابھی کچی عمر ہے۔ دونوں جگہ کی ذمہ داریاں نہ نبھاسکے گی۔“

”اماں جان گھر کی ذمہ داریاں میں خود اٹھانے کے قابل ہو گیا ہوں۔ جو کام شرمیلی سے نہ ہو سکے گا۔ وہ میں انجام دوں گا۔ اسے بھی زندگی گزارنے کا حق دیجیے۔ میرے ساتھ بڑی بڑی اپناج ہو گئی ہے۔ ذرا کالج میں اس کا بدل بھل جایا کرے گا۔ سہیلیوں سے ہنس بول آیا کرے گی۔ تعلیم بھی حاصل کر لے گی۔ کل کو پتہ نہیں کون سا وقت آئے۔“

”جو مرد گھر کی ذمہ داریاں اٹھانے کا تہیہ کر لیتے ہیں ان سے بڑھ کر بے وقوف کوئی نہیں ہوتا اور جو عورت باہر کی دنیا میں دلچسپیاں ڈھونڈنے لگتی ہے۔ اس کے قدم واپس گھر کی دہلیز پار نہیں کرتے بے وقوف۔ جو جس کا کام ہے اسی کو جتنا ہے۔ چند دنوں کی بات ہے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے کی طرح سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک آدھ بچہ ہو گیا تو مصروفیت ہی مصروفیت ہے۔“

مگر اولیس تو اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ دن رات شرمیلی کی وکالت کرتا رہا۔ شرمیلی کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا چنداں شوق نہیں تھا۔ وہ بھی اماں جان کی ہاں میں ہاں ملائی رہی۔ مگر اولیس نے آخر اسے کالج میں داخلہ دلوا ہی دیا۔ ان کے ہمسائے میں دو بہنیں کالج جاتی تھیں۔ دیکھنے میں بہت اچھی اور ملنسار تھیں۔ اولیس نے شرمیلی کو سونپا اور مونپا کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے ہی اس کی فیسیں جمع کرائیں۔ اسے کالج کے طور طریقے بتائے اور انہی کے ساتھ شرمیلی بس پر کالج جاتی اور آتی۔

کر پتہ چلتا کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا ہے یا نہیں۔ اسے اس بات پر پروا نہیں آیا کہ ایک بار پھر اولیس ایک روح کش اذیت سے گزرے گا۔ روپنا اے بے بسی پر آیا کہ لمبے رینگ رینگ کر کیسے گزاریں گے؟ یہ عذاب کیسے سہا جائے گا؟

پراولیس اس تسلیاں دیتا رہا کہ وہ کسی بھی تکلیف سے گھبرانے والا نہیں ہے۔ اللہ کو اگر یہی منظور ہے تو وہ اس اذیت سے بھی گزر جائے گا اور پھر جلدی اچھا ہو کر اس کو جگہ جگہ کی سیر کرانے لے جائے گا۔

اب کے اولیس نے محسوس کیا تھا کہ شرمیلی کی دلچسپی ہر کام میں ختم ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس کی ایک ٹانگ ٹھیک ہو چکی تھی اور ڈاکٹر نے کسی کسی وقت بے سارکھی کے سہارے چلنے کو بھی کہا تھا۔ مگر دوسری ٹانگ بالکل پتھر بنی ہوئی تھی اور اس پر اسی طرح پلستر چڑھا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ بھی جاتا۔ بہت سے اپنے کام خود کر لیتا۔ مگر شرمیلی میں وہ پہلا سا چلیلا پن اور مستعدی نہیں تھیں۔ جیسے ہر کام بڑی بے زاری اور مجبوری سے انجام دیتی اور تو اور پی وی بھی شوق سے نہ دیکھتی۔ جلد ہی بند کر کے سو جاتی۔ پھر رات گئے تک شرمیلی بستر پر اوندھی بڑی سکیاں بھرتی رہتی۔ اولیس پوچھ پوچھ کر تھک گیا تھا مگر وہ کیا بتاتی۔ اولیس بھی کوئی نادان نہیں تھا اسے شرمیلی کی کیفیت کا پورا پورا اندازہ تھا۔ اس کی تنہائی اور بے بسی پر ترس آتا تھا۔ نادان تھی، معصوم تھی ان حالات کا سامنا کرنا اس کے بس کی بات تھی۔ وہ سارا دن اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ بھی اس کی طرح گھر میں معذور ہوئی بڑی تھی۔ آخر اس معصوم کا کیا قصور تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے ایک دن فیصلہ کر لی لیا اور جب اماں جان سے اجازت طلب کی تو وہ سمجھ اٹھیں۔

”شرمیلی کالج میں داخل نہیں ہو گی۔“

کالج کی تعلیم کی تو وہ پہلے ہی مخالف تھیں۔ اسی لیے تو انہوں نے میٹرک کے بعد انے

اپنا جوجاتا ہے تو معاشرہ مذہب اور اخلاق کے حوالے دے کر جوان اور نوجوز عورت کو اس کے ساتھ ہی جوانی خاک کر دینے پر مجبور کرتا ہے اور اگر بیجاری عورت کسی حادثے کا شکار ہو جائے یا اس میں ذرا ساجسنانی عیب پیدا ہو جائے تو مرد فوراً عذر پیش کر کے دوسری شادی رچا لیتا ہے۔ وہاں وہ سبحان اللہ! یہ ہے آپ کے معاشرے کا انصاف۔“

اس پراقتی تالیاں نہیں کے بال میں ہنگامہ ہو گیا۔ لیکن شرمیلی کے تودل و دماغ کی دنیا ہی پلٹ گئی۔ واقعی سونیا نے ٹھیک ہی کہا تھا اور وہ خود معاشرے کی اس نا انصافی کی زندہ مثال تھی۔ وہ سارا دن کالج میں گھومتی رہی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ جا کر یہ سب باتیں اوئیں کو بتائے گی۔ وہ شرمندہ ہوگا لیکن گھر آئے تب تک اس نے محسوس کیا کہ اوئیں کو اس قسم کے خیالات سے آگاہ کرنا بہتر نہیں۔ ممکن ہے وہ اماں جان پر دباؤ ڈال کر اسے کالج سے ہی اٹھوا لے اور آراؤنی اور کھلی ہوا کا جو ایک دروازہ کھلا ہے وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔

لیکن اس رات شرمیلی نے اوئیں کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ نہ بات کرنے کو اس کا دل چاہا۔ اس اپنا جوجے شخص سے اسے بڑی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ جو انتہائی خود غرض تھا۔ اپنی خدمت کروانے کے لیے اسے اپنی سے لگاے بیٹھا تھا۔ جسے اپنے کل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اور لنگڑا بھی ہو سکتا تھا۔ اس کی ٹانگ کٹ بھی سکتی تھی۔ وہ زندگی بھر کے لیے اپنا جوج بھی ہو سکتا تھا۔ مگر کس قدر وثوق کے ساتھ کل کی بات کرتا تھا۔

اسے ایک بیک اوئیں سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اماں جان زہر لگتے لگیں۔ ساری دنیا فضول اور بودی دکھائی دینے لگی۔ مگر نہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو باز رہتی۔ اس نے ایسے ماحول میں پرورش نہیں پائی۔ اوئیں بے چارے کا کیا قصور.....؟ کوئی اپنی خوشی سے اپنا جوج نہیں ہوتا؟

لیکن ایک حقیقت کا تو سامنا کرنا ہی تھا۔ فرض کرو کہ اوئیں کی دوسری ٹانگ ٹھیک نہ ہو

کالج کی دنیا بھی الگ ہی دنیا تھی۔ پہلے پہل تو شرمیلی بوکھا گئی۔ پھر رفتہ رفتہ عادی ہونے لگی۔ سارے دن کی روداد اکراوئیں کو بتا یا کرتی، انگریزی کا مشکل سبق بھی اس سے پڑھ لیتی۔ اپنے لباس وغیرہ کا بہت دھیان رکھتی اور بدلتے بدلتے شرمیلی اتنی بدل گئی کہ اوئیں کو چونک کر اس کی سمت دیکھنا پڑا۔ جب وہ صبح بن ٹھن کر کالج جاتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی بہت بڑی پارٹی میں جارہی ہے۔ اس کے آنے کا بھی کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ پھر اس پر تھکاؤ اتنی غالب آتی کہ گھر کے کسی کام کو تھک نہ لگاتی۔ حتیٰ کہ وہ اوئیں کا حال پوچھنا بھی بھول جاتی۔ جب اوئیں دے الفاظ میں گلہ کرتا تو وہ اپنی تھکاؤ کا بہانہ کر دیتی۔ بسیں بدلنا، سڑکوں پر کھڑے ہو کر خاک پھانکنا، بھوکے پیاسے گھر آنا۔ اس پر طے سننا، شرمیلی روئے لگ جاتی اور اوئیں اپنے ہی الفاظ پر شرمندہ ہو جاتا۔ حقیقت میں شرمیلی کی اس تبدیلی کی وجہ سونیا اور سونیا دونوں بہنیں تھیں۔ وہ بڑی آزاد منش اور بڑے قسم کی لڑکیاں تھیں۔ ان کی ماں کرچن تھی اور باپ مسلمان تھا۔ گھر میں تو ان کی فطرت کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ مگر کالج میں دونوں بہنیں شیطان کی طرح بدنام تھیں اور سارا اسٹاف ان سے ڈرتا تھا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے ایک عجیب ساز ہر شرمیلی کے اندر اڈینا شروع کر دیا تھا اور اصل تبدیلی شرمیلی میں اس دن آئی جس دن ان کے کالج میں انٹر کالجیٹ ڈیپٹ تھی اور موضوع تھا ”آج کے معاشرے میں بھی عورت مظلوم ترین ہے۔“

سونیا نے موضوع کے حق میں دھواں دھار تقریر کی اور مثالیں دے کر واضح کر دیا کہ عورت مظلوم تھی، مظلوم ہے اور مظلوم رہے گی۔ جب اس نے بڑے جوش میں آ کر یہ دلیل پیش کی کہ ”حضور والا! مرد نے ہمیشہ عورت کو اپنا آلہ کار بنائے رکھا ہے۔ اپنی ضرورت کے تحت جو صورت پسند آئی اس کو عطا کی۔ ضرورت کے تحت اس کو طوائف بنایا۔ ضرورت کے پیش نظر بیوی اور بیٹی کہا۔ مگر اتنا دیکھیے کہ جب کوئی مردنا کارہ ہو جاتا ہے بیمار ہو جاتا ہے یا

رفتہ شرمیلی نے ان سے دوستی پیدا کر لی اور ہر وقت ان سے ماڈلنگ کے بارے میں طرح طرح کے سوالات بھی کرتی رہتی۔ اس کا شوق دیکھ کر ایک بار انہوں نے اسے شوٹنگ دیکھنے کی دعوت دی۔ اگر وہ اویس سے پوچھتی تو وہ ہرگز اسے اجازت نہ دیتا۔ اس لیے اس نے بہانہ کیا کہ ان کی کلاس میوزیم دیکھنے جا رہی ہے۔ وہاں شوٹنگ دیکھ کر اتنا مزہ آیا کہ حد نہیں اور پھر ہر شخص بس اسی کو دیکھ جا رہا تھا۔ ترو تازہ اور زم کیوں جیسا اس کا حسن تھا۔ سنو بلیو میں سارے مرد اس پر پروانہ دار گرنے لگے۔ ایک صاحب نے اسے اگلے اشتہار کے لیے آفر بھی دے دی۔ ایک اور صاحب جوئی وی سے متعلق تھے ایک ڈرامے میں ہیروئن کی پیش کش لے کر آ گئے تھے۔ اتنے اشتہاں اس کی اتنی قدر قیمت ہے وہ جانتی ہی نہ تھی۔ اس نے صاف طور پر انکار تو نہیں کیا مگر اقرار بھی نہیں کیا۔ البتہ اس بات پر وہ رضامند ہو گئی کہ ایک دن سنو بلیو آ کر سکرین ٹیسٹ بھی کرائے گی۔ وہ ان خوش نصیبوں میں سے تھی جن کی آواز سکرین پر صورت کا پورا ساتھ دیتی ہے۔ پھر تو دھڑا دھڑا اس کو آفرز آنے لگیں۔ اس نے بہتیرا کہا کہ گھر میں اسے اجازت نہیں ملے گی۔ مگر لوگوں نے اسے کب چھوڑا..... مرد جانتے ہیں ایک لڑکی کو گھر سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ چائے پارٹیاں، پیکچر تھقے تھائف، وہ ہولکا کر رہ گئی۔ اس پر سونیا اور مونا کا باؤ۔ وہ تو بہتی تھیں ”جب تم گھر میں پیسے لانے لگو گی تو اویس کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ پیسہ بڑے بڑے منہ زور مردوں کا بھی منہ بند کر دیتا ہے۔ ورنہ تم صاف صاف کہہ دینا کہ وہ تمہارے اخراجات نہیں اٹھا سکتا۔“

دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں۔ شرمیلی کا بدلا بدلا چہرہ اویس بھی دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کو اس کے دل کے بدل جانے کا گمان تک نہ تھا اور پھر اتنی جلدی، لیکن ڈر کے مارے بات بھی شروع نہیں کر تھا تبھی اسے اس کے لاشعور میں کوئی خوف ساہو۔

ادھر شرمیلی نکلتی جیسا تھا۔ ایک اشتہاری فلم والے اس کے پیچھے بڑے ہوئے تھے

یا کٹ دی جائے تو کیا وہ زندگی بھر کے لیے اسے قبول کر لے گی۔ کالج میں داخل ہونے سے پہلے تو شاید وہ بلا سوچے سمجھے ہاں کہہ دیتی۔ مگر اب وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

سونیا اور مونا اسے کہیں کہہ وہ ایک قدر حسین ہے کہ اچھے سے اچھا مرد اسے قبول کر سکتا ہے۔ دیکھو نا! ہم دونوں ہمیں اتنی خوبصورت بھی نہیں ہیں مگر اس بات میں۔ دیکھا یہ مرد ہم پر کیسے مرتے ہیں جس کو بھی وقت دیں وہ آنکھوں کے بل چل کر کالج سے لینے آ جاتا ہے اور تمہیں تو اپنی قدر و قیمت ہی نہیں معلوم۔ ایک تو تم نے چھوٹی عمر میں شادی کا پھندا اگلے میں ڈال لیا۔ اس پر اب اپنی جوانی ایک معذور شخص کے لیے تباہ کر رہی ہو۔ کالج میں جن لڑکیوں کے گروپ میں وہ رہتی تھی۔ ان سب کے طور پر ملتے جلتے تھے۔ سبھی نے ہوائے فریڈ ز رکھے ہوئے تھے۔ جب ان کے والدین انہیں کالج میں چھوڑ کر چلے جاتے تو وہ اپنے دوستوں کی مونروں میں بیٹھ کر جانے کہاں چل دیتیں اور پھر چھٹی سے ڈرا پہلے آ جاتیں۔ ان کے پرس ہمیشہ نوٹوں سے بھرے رہتے۔ ان کے پاس بے شمار خوب صورت کپڑے ہوتے اور وہ کسی کی پروا نہیں کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ انہیں کالج سے نکالے جانے کا بھی ڈر نہیں تھا۔

شروع شروع میں وہ ایک بار شرمیلی اویس سے اجازت لے کر سونیا اور مونا کے ساتھ فلم دیکھنے بھی گئی تھی۔ وہاں سونیا اور مونا کے ہوائے فریڈ ز بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ بات اس نے اویس کو نہیں بتائی تھی۔ وہ سارا وقت اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے رہے اور اس کے ساتھ بہت فنی مذاق بھی کرتے رہے۔ ان کے شوخ فقرے اسے بہت اچھے لگ رہے تھے اس کے علاوہ ہر مرد کی پرشوق نگاہ اس پر پڑتی تھی۔ اب تو وہ کئی دفعہ چوری چوری بھی اپنی سمیلیوں کے ساتھ میٹھی شو دیکھ کر آتی اور آ کر اویس سے کہتی بس نہ ملے گا اور کبھی لیٹ کلاسز کا بہانہ نہ دیتی۔ اویس شرمیلی کو اتنی معصوم شے سمجھتا تھا کہ اس کی کسی بات کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہیں کالج میں کچھ لڑکیاں ایسی بھی پڑھتی تھیں جو ماڈلنگ کرتی تھیں۔ رفتہ

اور اس کے چہرے کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم ادا کرنے کو تیار تھے۔ وہ رات کو سوتے میں پرستان میں پہنچ جاتی۔ جہاں لمبے لمبے فعل اپنے وہ آوارہ بادلوں میں تیرتی پھرتی۔ آسمان سے زمین تک اس کی مسکراہٹیں کھڑ جاتیں اور پھر دو مضبوط بازو اس کو ہٹا لیتے۔ اپنے سینے سے لگا لیتے اور وہ دونوں خوشیوں میں ڈوب جاتے۔ اس دنیا سے بے نیاز اس دنیا سے بے پروا.....

کبھی وہ بھی سبائی تھ پر سوار ہوتی اور ایک بانکا چھبلا شہزادہ اس کے پہلو میں بیٹھا اس کے چہرے کے نکھار میں ڈوبا جاتا۔ کبھی وہ جھاگ اڑاتے نب میں سے ٹکلی اور یونانی دیوتاؤں جیسے نوجوانوں کے بازوؤں میں جھوم جاتی۔

ہر رات وہ نئے خیالوں کے ساتھ نئے سپنے سبائی۔ ہر روز اپنے حسن کو پہلے سے دگنا پاتی۔ ہر صبح فیصلہ نہ کر سکتی کہ وہ کیا کرے۔ اوہیں سے بات کرے تو کس طرح اور تانہ بڑا بھگڑا کھڑا کرنے کا حوصلہ کہاں سے لائے؟ یہ کام بھی سونا اور مونا نے اس کے لیے آسان کر دیا۔ انہوں نے زبردستی کنٹرول پر اس کے دستخط کرا دیے۔ جب شوٹنگ کے دن قریب آنے لگے تو شرمیلی نے اپنا عندیہ اوہیں پر ظاہر کر دیا۔ اوہیں اس قدر حیران ہوا کہ کتنی دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔ صدمے سے اس سے بولا نہ گیا۔

کیا یہ اس کی شرمیلی تھی۔ معصوم بھولی بھالی سادہ لوح باحیا، الجھنی، کم گو، کم سخن، کم زبان۔

جس کو چھوٹو چھوٹی موٹی بن جاتی تھی۔ ہاتھ لگا دو تو سینے میں تر ہر ہو جاتی تھی۔

اماں جان ٹھیک کہا کرتی تھیں کہ اس کو اتنی ڈھیل نہ دو۔ یہ سخت ماحول میں پٹی ہے۔ اس کی اٹھان چند ہرے نکلے اصولوں پر کی گئی ہے۔ میں نے تو اس کے پر نکلتے ہی کاٹ دیے تھے۔ اب اس کو قوت پر واز نہ بخشو۔

قوت پر واز تو اس نے اس لیے بخشا چاہی کہ وہ زندگی کی آگنی حاصل کرے۔ کچھ جان پائے۔ گھور اندھیرے میں نہ پڑی رہے۔ محبت کرنے کا سلیقہ آئے اس کو۔ اس کا حسن جلا پائے۔ وہ جنگلی کے ایک مقام کو چھو لے۔

مگر اس لیے تو نہیں آزادی دی تھی کہ وہ راستے جدا بنا لے۔ سنگلاخ زمینوں کا سفر شروع کر دے یا اندھیرے آسمانوں کی جانب اڑنا چاہے۔ یہ بھی اس کی ایک بھول تھی۔ نادانی تھی ایک بچکانہ ضد تھی۔ اوہیں کا خیال تھا وہ اس کے ارادے بدلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ کچھ دنوں بعد اس کی پٹی کھلنے والی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے اس شہر سے لے کر کہیں دور چلا جائے گا۔ ہر روز کسی نہ کسی بات پر وہ اس سے اچھڑ کر کالج جاتی۔

اور پھر ایک دن جب وہ رات گئے لوٹی اور اس نے چہرے پر عجیب و غریب قسم کا میک اپ کر رکھا تھا تو اوہیں کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا جو قدم فوری اٹھانا چاہیے تھا اس میں دیر کیوں ہوئی۔ شرمیلی پیسے وصول کر چکی تھی اور فلم بننا شروع ہو گئی تھی۔

اب چیخ چیخ اور بک بک بے نتیجہ تھی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ”وہ یہ کام کرے گی اور بھی تو شریف گھرانوں کی لڑکیاں یہ کام کرتی ہیں۔ اگر میں کر لوں گی تو کون سا آسمان گر پڑے گا؟“

”تمہارے لیے میں جو ہوشو! میں تمہارے لیے کام کروں گا“ پیسہ کماؤں گا اور تمہاری ہر ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش پوری کروں گا۔“

”تم۔ اس نے حقارت سے کہا۔ ”تم کیا کرو گے اور تم کیا کر سکتے ہو۔ ایک اپانچ آدی جو دوسروں کا دست نگر ہو۔ وہ کسی کی خواہش پوری کر سکتا ہے۔“

اوہیں سناٹے میں آ گیا۔ آج اس کو اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں جس قدر شدید درد

محبت کی گردان اسی طرح کر سکتا تھا۔ ورنہ میں جانتی ہوں شوہر کی محبت کیا ہوتی ہے۔ گھر میں مرد لفظ محبت کا سہارا اس لیے لیتے ہیں کہ وہ اس لفظ کا سنہری ذخیرہ بنا کر اس میں اپنی بے وقوف بیویوں کو عمر قید کی سزا دیں۔ لیکن خود باہر نکل کر کیا کرتے ہیں۔ سارے کوٹھے انہی شادی شدہ مردوں کے کم سے آباد ہیں۔ ہسٹلوں اور رہسٹو رانوں میں بیانیہ معشوقاؤں کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور فترتی اوقات میں زیادہ تر کالجوں اور یونیورسٹی کی لڑکیاں ان کی موٹروں کی امین ہوتی ہیں۔“

”شٹو! او ایس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔“ تم کتنی آگے نکل گئی ہو کتنی آگے میں تو ابھی تک وہیں کھڑا ہوں جہاں سے ہم نے سفر کی ابتدا کی تھی۔“

”اور تم ہمیشہ یہیں کھڑے رہو گے اور کھڑے کھڑے ساکت ہو جاؤ گے کیونکہ تم میں آگے بڑھنے کی سکت ہے اور نہ امنگ اور کہیں سے میرے اور تمہارے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔“

”تم اسے جلدی کا فیصلہ کہتے ہو۔ میں نے تو یہ فیصلہ کرنے میں چھ ماہ لگائے ہیں اور اب جبکہ میں نے اپنے کیریئر کی ابتدا کر لی ہے تو پیچھے قدم نہیں ہٹا سکتی۔ میں ایک اشتہاری قلم میں کام کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چھ اور آفرز مل رہی ہیں۔ تم میں حوصلہ ہے تو میرے ساتھ گزارا کرو۔ ورنہ جس طرح اپنی ناکارہ ٹانگ کاٹ کر پھینک دو گے مجھ سے بھی قطع تعلق کر لو۔“

آہ..... یہ ناکارہ ٹانگ جس نے زندگی کی ساری تہاؤں کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ اب کے شوق تھا جی بھلائی کا۔ کس کے جی میں امنگ تھی جینے کی۔ حیات کا رس پینے کی۔ ایک ہم سفر جھٹک کر دامن چھڑا رہا تھا اور دوسرے کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ تنہا کی شعل بھج جائے تو راستے نظر نہیں آتے۔ کتنی عجیب بات ہے جہاں سے شریلی اپنی فی خوب

محسوس ہوا تھا وہ غالباً حادثے کے وقت بھی نہ ہوا ہوگا۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے اپنے غم و غصہ پر قابو پایا۔ آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو بیا اور پھر اپنی آواز میں محبت کی نرمی پیدا کر کے بولا۔

”خشو حادثے تو زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ انسان بعض اوقات تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ مگر مستقبل کے ساتھ ہمیشہ اچھی تو قعات وابستہ رکھنا یہ تین زندگی ہے۔ میں مایوس تو نہیں ہوں۔ تم مجھے ایک اور موقع دو۔ میری پنی کھٹلے دو میں تمہیں اس طرح ڈانواں ڈول نہیں چھوڑوں گا۔“

”تمہاری پنی تو قیامت تک نہیں کھل سکتی او ایس“ شریلی نے نفرت سے کہا۔ خدا معلوم اب بھی تمہاری ٹانگ ٹھیک ہوتی ہے یا نہیں اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری ٹانگ کانٹنی بھی پڑ جائے۔ ایسی صورت میں ایک اپنا جج کے ساتھ میں اپنی زندگی کو مخلوچ نہیں کر سکتی؟ مجھے اپنا مستقبل عزیز ہے۔ آج وقت میرے اختیار میں ہے۔ میں اپنے کیریئر کی ابتدا کر رہی ہوں۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ اگر تمہیں اعتراض ہے تو میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ میں تمہیں اچھی زندگی دے سکتی ہوں اور ہمیشہ اپنا شوہر تسلیم کرتی رہی ہوگی۔ لیکن اگر تم میرے کیریئر کے راستے میں آن کھڑے ہوئے تو پھر مجھے راستہ کاٹنا پڑے گا۔“

شٹو!..... کتنی بے دردی سے تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تم بول رہی ہو۔ ذرا سوچو! کتنی محبت سے میں نے تمہارے ساتھ شادی کی تھی۔ کتنی الفت سے میں نے تمہیں قریب رکھا اور کتنی بے شمار چاہتیں جو میں مستقبل میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ ہم نے ایک خوب صورت دنیا بسائے کا عہد کیا تھا۔ ابھی تو وہ دنیا بسائی نہیں کہ تم اسے اجازت دے رہی ہو۔

”او ایس“ شریلی نے نفرت سے کندھے اچکائے۔ ”محبت محبت..... ایک لولا انگڑا مرد

صورت اور امانگوں بھری زندگی کی ابتدا کر رہی تھی۔ وہیں یہ اویس کی زندگی کی ساری حرارت تپش اور امنگ ختم ہو رہی تھی۔ ایک کا اختتام دوسرے کا جنم ہوتا ہے اسے معلوم نہ تھا۔

بہت دنوں تک تو تو میں ہوتی رہی۔ تکرار و اصرار ہوتے رہے۔ منت ساجت کی منزلیں طے ہوتی رہیں، لوگ بچ بچاؤ میں مصروف رہے۔ اماں جان نے زبردست قسم کی دھمکیاں دیں، ڈراوے دیئے، ہر ممکن تدبیریں کی گئیں۔ مگر شرمیلی کے لیے تو ایک جہان نو کے درواہا کھلے تھے۔ زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں اور خوبصورتیوں سمیت اس کے آنگن میں چھم چھم ناچنے لگی تھی۔

ایک نیا چہرہ، ایک خیر جواںی منظر پر آئی تھی۔ لوگ پرانے چہرے دیکھ دیکھ کر تھک چکے تھے اور پھر ہر ممکن طریقے سے اس چہرے کو ششے میں اتارنے لگے۔ موثریں اس کے آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ اس سے منت ساجت کر کے ملاقات کے وقت لیے جانے لگے۔ اس کی بہت سی اشتہاری فلمیں بننے لگیں۔ پہلی لڑکیاں اس کے مقابلے میں رو کر دی گئیں۔ صابن کے اشتہار، کپڑوں کے اشتہار، سگریٹوں کے اشتہار، چائے کے اشتہار۔

اور جب عورت مرزا پاشا اشتہار میں ڈھل جائے تو شوہر اس سے دستبردار ہو جاتا ہے کہ اشتہاری عورت کسی کی نہ ہونے کے باوجود سب کی ہوتی ہے وہ اسے تصور میں رکھیں یا بندروم میں۔

جس دن اس کی پہلی فلم ٹی وی پر دکھائی گئی۔ اسی دن اماں جان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ شرمیلی نے بھی سنگمر روشنیوں میں موت کی آواز زیادہ لرزہ خیز محسوس نہیں ہوتی۔ اس نے کہا۔ ”اماں جان اپنی عمر طبعی پوری کر چکی تھیں۔ ویسے ہی انہیں مرنے کا بہانہ چاہیے تھا چلو اچھا ہوا ان کو بہانہ تو ملا۔“

وہ اپنی ہم پیشہ لڑکیوں کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ خوب صورت ملبوسات کے

ذہیر تھے اس کے پاس اپنی مرضی سے آتی تھی، اپنی مرضی سے جاتی تھی۔ شوقین مزاج لوگوں کی موثریں اس کو لانے لے جانے پر مقرر تھیں۔ ہٹلوں میں کھانا کھانا اس کے لیے معیوب نہ تھا۔ اب وہ شرمیلی بیگم سے مس شرارہ بن چکی تھی۔

مس شرارہ جو نو جوان دلوں کی دھڑکن تھی۔ کالج کی لڑکیوں اور لڑکوں کا کریمہ تھی۔ مالدار مردوں کی آنکھوں کا تار تھا، قیاسی اور اشتہاری فلموں کی روح رواں تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں اس نے عرب کی ساری منزلیں طے کر لی تھیں۔ مگر ایک منزل ابھی باقی تھی۔ اسے طے کرنا اس کے لیے دنیا کا کٹھن ترین مرحلہ بن چکا تھا۔

شاہد اس لیے کہ اس کے اندر کی شرمیلی کی کوئی شبیہ ابھی باقی تھی یا پھر یہ اماں جان کی نماز والی چوکی کا اثر تھا جس پر بیٹھ کر اس نے زندگی کا بیشتر وقت گزارا تھا۔

اسے اس کا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ مردوں کی جاہت اور اس والہانہ انداز کا درپردہ کیا مطلب ہوتا ہے۔ ان کے تحفے، تحائف اور تحلیے کس بات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اپنی تجویزوں کے منہ و نو جوان عورت کے لیے کیوں کھول دیتے ہیں۔ مگر اس کا دل یہ بات ماننے پر تیار نہ تھا۔ ایسا نہیں کہ اس کو اویس سے والہانہ محبت تھی۔

مگر ابھی تک وہ اپنے آپ کو بچانے ہوئے تھی۔ جب وہ سب مردوں کی نظروں میں ایک ہی ہوں، دیکھتی اور سب کی زبان سے محبت کو اسی مفہوم میں ڈھلتے محسوس کرتی تو اسے بہت دکھ ہوتا۔ ابھی تک اسے ایک شہزادے کا انتظار تھا۔ جوان سب سے مختلف ہوتا۔ ان سب سے اونچا ہوتا۔ ان سب سے اعلیٰ ہوتا۔ جس کے قدموں میں وہ اپنا آپ رکھ دیتی۔ جب بھی کوئی نیا آدمی اس سے ملوایا جاتا یا ملنے آتا۔ اس میں اپنے تصور رائی شہزادے کو ڈھونڈتی مگر اسے ناکامی ہوتی۔ مرد تو اسے صرف ایک عورت سمجھ کر اس کے پاس آتے تھے۔ ان سے حد درجہ نفرت محسوس ہوتی اور وہ دامن جھٹک کر چل آتی۔

شرارہ نے شرما کر ایک چھوٹی سی جمائی لی اور پھر بولی۔ "اب ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ آپ کی مہمان نوازی نہ کر سکیں۔ آپ یہاں میرے کمرے میں رہ سکتے ہیں۔ میں ڈرائنگ روم میں سو جاؤں گی۔"

پھر سینھ صاحب اسے اس کے تحائف دکھانے لگے۔

دولت میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ سونا نامہ ادا نہیں لوٹا۔ سینھ صاحب نے اسے بتایا کہ وہ اس کے مکان کے لیے کہیں زمین کا مناسب ٹکڑا حوضہ رہے ہیں۔ تاکہ وہ سکون سے اپنا گھر بنا کر رہے۔

مرد عورت کے اوپر ایک سوچی سمجھی تسلیم کے تحت احسان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو روپے اور سونے سے لاد دیتا ہے۔ اس کا ہر مطالبہ پورا کرتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس احسان کا بدلہ چکانے کا ایک اور صرف ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے۔

اس کا احساس اس گھر شرارہ کو بھی ہوا۔ بالآخر وہ ہار گئی۔ سینھ صاحب کی محبت جیت گئی۔ ان کے مزید احسان خاموشی سے نہ اٹھائے جاسکے۔

صحیح جانے کی بجائے سینھ صاحب پورے چندرہ دن مری میں رہے اور یہیں سے شرارہ کی نئی زندگی کی ابتدا ہو گئی۔ کراچی آتے ہی اسے دو کنال زمین کا کنٹرول مل گیا۔ جس پر وہ اپنی مرضی کا مکان بنا سکتی تھی۔ سینھ صاحب نے تو صرف اتنی ہی آفر دی تھی۔

اس کے بعد اسے گھر بھی ہونا تھا۔ جب گھر بنا کر دینے کا مذایک پٹرول پمپ کے مالک نے لے لیا۔ جس کی دو ملیں بھی تھیں تو کچھ عرصہ کے لیے اسے اپنا آپ اس کے حوالے کرنا پڑا۔ بڑا خوب صورت سٹائنلش اور ماڈرن گھر بن گیا۔ تب تک پٹرول پمپ کے مالک کا دل بھی بھر چکا تھا۔ اب شرارہ چاہتی تھی جس طرح مکان خوب صورت بنا ہے اسی طرح یہ اندر سے بھی سجایا ہو اور ضرورت کی ہر شے وہ کس طرح حاصل کر سکتی ہے یہ گراس کو

لیکن وہ بھی جوان تھی۔ اس کا دل بھی اٹکلوں بھرا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے دل کے ہاتھوں عاجز آ جاتی۔ پر کون تھا جو اس کے ساتھ شادی کر لیتا۔ رات کے سین تھیلے بٹخا اور دن کے بنگاموں کی اجازت دے دیتا۔ ساری سہیلیاں اسے بار بار سمجھا چکی تھیں کہ اس دیوار کو بھی تو زنا پڑے گا۔ زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے اخلاق پر حدیں مقرر نہیں کرتے۔ وہ بہت گھبرائی تھی اور تھک بھی چکی تھی۔ اس نے سوچا وہ کچھ دنوں کے لیے مری چلی جائے۔ ان دنوں ایک سینھ صاحب اس پر فریفت تھے اور وقت بے وقت اس کے لیے اپنی موٹر بیج دیا کرتے تھے۔ اس نے ان سے ذکر کیا تو انہوں نے جھٹ سے مری کے ایک شاندار ہوٹل میں اس کے لیے ایک سوئٹ بک کر دیا اپنی کارڈی جو بے شمار قسم کے تھکوں سے بھری ہوئی تھی جو اسے مری چھوڑ کر آئی۔ ہر رات سینھ چل حسین فون پر اس کا حال پوچھتے مری کا موسم جانتے اور پھر فون بند کر دیتے۔

چند دن یہاں رہ کر اس کی طبیعت بحال ہو گئی تھی۔ وہ واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ ایک رات کو اس کے کمرے کی کھنٹی بجی۔ اٹھ کر معلوم کیا تو یہ چلا کہ سینھ صاحب بنفس نفیس تشریف لائے ہیں۔ اپنی جھاروں والی ٹائیس میں وہ کوئی آشت قسم کی شے لگ رہی تھی۔ سینھ صاحب اپنے ساتھ اس کے لیے اتنے بے شمار تحائف اور زیورات لائے تھے جنہیں دیکھ کر وہ مبہوت ہو گئی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں اسلام آباد میں ایک ضروری کام تھا۔ پھر انہوں نے سوچا جاتے جاتے اس کی خبر بھی لے چلیں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ بس ایک گھنٹہ بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔

"اس وقت اتنی رات گئے" شرارہ نے ادا سے پوچھا۔

"ابھی اس اور کیا ہو سکتا ہے۔ تمہیں ایک نظر دیکھنے کو دل چاہتا۔ سو دیکھ لیا ماشاء اللہ تم تو پہلے سے بھی قیامت نکل آئی ہو۔"

آ گیا تھا۔

ہمیشہ موٹی اساسیوں پر نظر رکھتی۔ جب سلیمان آفاقی کی ٹیکسٹائل ملوں اور تالین سازی کی فیکٹریوں کا اسے اندازہ ہو گیا تو وہ کچھ دنوں کے لیے اس حرم میں داخل ہو گئی۔ اس کے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کا سامان خاص طور پر اٹلی سے منگوا یا گیا۔ ایسے خوب صورت مبل تھے کہ بے اختیار ڈوب جائے کو دل چاہے اور بیڈ روم اس کا تو بس ڈریم لینڈ لگتا تھا۔

اس کا گھر اس کے تصور سے بھی کہیں حسین بن گیا تھا۔ اس کے سٹے جٹنے والوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی نے فون لگوا دیا تھا تو کسی نے کار خریدی۔ کسی نے ایر کنڈیشن لگوا دیا تو کوئی تھتے میں ریفریجریٹر دے گیا۔

دنیا کی کون سی آسائش تھی جو اس کے گھر میں تھی۔ اس کا اپنا ایک اسٹیشن بن گیا تھا۔ وہ اپنی کار لے کر سڑکوں پر نکل جاتی تو لوگ دم سادھے اسے دیکھا کرتے۔

مس شرارہ! اس شرارہ! کا شور مچ جاتا۔

سوسائٹی کے اونچے حلقے میں وہ ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔ مقتدر ہستیاں اپنی محفلیں جانے کے لیے اسے باتیں گفٹگو کے آداب اس نے سیکھ لیے تھے۔ اٹھنے بیٹھنے کا قرینہ اسے آ گیا تھا۔

اب تو اسے فلموں کی طرف سے بھی آفر آتی تھی۔ کافی عرصے سے فلم انڈسٹری کے لوگ بھی اس کے پیچھے پڑے تھے۔ تب اس نے سوچ سمجھ کر ایک فلم کے لیے معاہدہ کر لیا تھا۔ اگر وہ فلم بہت ہو جاتی تو پھر اس کی زندگی کا ایک بڑا خواب پورا ہو جاتا۔

حسرت ایک اور تھی اس کی وہ ملک سے باہر جانا چاہتی تھی۔ باہر کی دنیا دیکھنا چاہتی تھی۔ باہر جانے سے بھی تو اسٹیشن کا پتہ چلتا ہے اور باہر لے جانے کی آفر اگر کسی نے اسے دی تھی تو وہ خواجہ ابراہیم تھا۔ خواجہ ابراہیم اسے بالکل پسند نہ تھا۔ گواس کے لوہے کے دو

کارخانے تھے اور اس کے پاس بہت مسافران آپینج بھی تھا۔ مگر وہ انتہائی مکروہ صورت آدمی تھا۔ ہمدقت اس کے منہ سے بوا آتی رزقی۔ کپڑے پہننے کا اسے سلیقہ نہ تھا۔ مگر وہ اس پر بری طرح فریفتہ تھا۔ ہر سال باہر کا نور لگاتا تھا اور شرارہ کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کی سیکرٹری بن کر اس کے ساتھ چلے۔ ساتھ جانے کو تو وہ ہزار جان سے تیار تھی۔ مگر خواجہ ابراہیم کو گوارا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی اور اس کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔ کیونکہ اس قسم کی آفر کوئی اور نہیں دے رہا تھا۔

وہ اسی سوچ کے مرحلوں میں تھی۔ یہ گندہ غلیظ مرد اسے بالکل گوارا نہ تھا۔

لیکن کبھی کبھی اس دکاش اور درج پرور بیڈ روم میں سوئے ہوئے وہ سوچا کرتی۔ کون سا مرد اچھا ہے جس کو اس نے خوشی سے گوارہ کر لیا۔ یہ زہر اس نے پی تو لیا مگر اس کی روح کو بھی چین نہ آیا۔ اپنا آپ بیچ کر کسی کسی نادرا اشیاء اس نے خریدیں کہ اپنا گھر بھریا۔ مگر اپنا وجود خالی ہو گیا۔ اس کا وجود دنیا کی ہر شے سے قیمتی تھا مقدس تھا نادر تھا۔ سستی اشیاء کا سودا اس نے ایک مہنگی چیز سے کر لیا تو مہنگی چیز بے حد سستی ہو گئی۔ سب کچھ ہونے کے باوجود اس کے پاس تھا ہی کیا۔ بے شمار زیور بیش قیمت کپڑے ایک بھرا ہوا گھر یہ سب اسے کیا دے سکتے ہیں؟

کسی قسم کی آسودگی نہیں دے سکتے۔ کتنے لوگ قریب آئے۔ اس کو ٹوٹ کر چاہا اسے پوجا۔ مگر کوئی اپنانے پر تیار نہ ہوا۔ اپنانے والوں کی شرطیں کڑی تھیں۔ جو اس نے گوارا نہ کیں۔ اس خوب صورت گھر کے دیدہ زیب بیڈ روم میں رات کو جب وہ اکیلی ہوتی تو سوچتی۔

میرا کون ہے۔ کون ہے جو صرف میرا ہے۔ یوں سب میرے تین مگر میں کسی کی ذمہ داری نہیں ہوں۔ میری کوئی سکیورٹی نہیں ہے۔ میرا کون محافظ ہے۔ ایک گیت پر چوکیدار

اس منڈی میں کورے مقدس پاک جسم نہیں سکتے۔ بکاؤ جسم تو دغا دار ہوتے ہیں۔ ایسا معصوم اور پاکیزہ جسم تو ماں کے پیٹ سے ملتا ہے اور پھر ماں کے پیٹ میں ہی ڈھل جاتا ہے۔ نہ وہ دوبارہ جسم لے سکتی ہے اور نہ جنم دے کر اتنی مقدس ماں بن سکتی ہے۔ احساس کے کچھو کے اسے بچھوؤں کی طرح لگتے۔ جب بھی اسے تجھ راتیں ملتیں۔ اس کی زندگی عذاب بنا دیتیں۔ اس کو راز فرار نہ ملتی۔ تب اس کو ایک ہی راہ راز نظر آتی اور اس نے اپنی شروع کردی یوں جن مخلوق میں وہ جاتی تھی ان کا تھا ضا تھا کہ وہ بپا کرے۔ یونہی وہ اسے ہاتھ نہیں لگا رہی تھی۔ مگر جب ضمیر اس کی روح کا کاٹنا بنے لگا تو اس نے جام ہاتھ میں لے لیا جس نے اسے کچھ اور بھی خوب صورت اور بھی سرکش بنا دیا۔ وہ اپنے آپ کو سوچنے کا وقت نہیں دینا چاہتی تھی۔ ہر وقت مصروف رہتی۔ اس لیے خواجہ ابراہیم سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا۔ جواسے بالکل غوارا نہ تھا۔ مگر اس نے اسے غوارا کر لیا تھا۔ وہ اب تک اسے اپنے ساتھ یورپ لے جانے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔

اس روز وہ بازار میں شاہجنگ کرتی پھر رہی تھی اور خواجہ ابراہیم پالتو کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے سامان اٹھاے چل رہا تھا۔

سڑک کے پار اس کی کار کھڑی تھی۔ جب ٹریفک رکا تو وہ سڑک پار کرنے لگی۔ مین سڑک کے درمیان میں پہنچ کر وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ سامنے سے ایک آدمی آ رہا تھا۔

ہاں اسے پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ وہ اویس تھا بالکل ویسا ہی..... چلتے میں ذرا لنگڑا تھا۔ آج وہ اس پر اپنی برتری کا ثابت کر دینا چاہتی تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اپنا آپ نمایاں کیا اور بالکل اس کی نظروں کے آگے آ گئی۔

اویس نے ایک اچھتی سی نگاہ اس مازن عورت پر ڈالی۔ بالکل اس طرح جس طرح کوئی راگبیر دیکھتا ہے اور پھر اپنے بیچ کی انگلی پکڑے ہوئے اس کے پاس سے گزر گیا۔ اس

ہے جس کو سوطر سے خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ رات کو ذرا کھٹکا ہو جان نکل جاتی ہے۔ یہی جو میری صورت کے پروانے اور میرے جسم کے دیوانے ہیں یہی میرے قاتل ثابت ہو سکتے ہیں۔ ذرا سے اختلاف پر میری جان لے سکتے ہیں۔

میرا کل کیسا ہوگا۔

میں تو بڑے مان سے کسی پر ہاتھ نہیں رکھ سکتی کہ یہ میرا ہے۔ سکھ کی نیند اس عورت کو آتی ہے جس کے کمرے میں ایک مرد سویا پڑا ہو۔ جو قافوئی طور پر اس کا ہو غریب ہو بد صورت ہو یا لالٹن گھر کا مرد ہوتا ہے۔

پروانے یا دیوانے وہ مرد نہیں بن سکتے۔

وہ مرد جو ایک معمولی سے معمولی عورت کو بھی فحش کی مانند نظر آتا ہے۔

فحش کے ساتھ ساتھ آسے سلیک پورٹی بچیوں کی صورت میں اس سودے میں کیا کھویا کیا پایا۔ اس ذلیل اور بزدل آدمی کے ساتھ رہ کر میں ہمیشہ ایک معمولی سی عورت چپقل کی مانند گھر کی دیواروں پر بٹکتی رہتی۔ وہ مجھے کیا دے سکتا تھا کچھ بھی نہیں۔

اچھا کیا میں نے اپنی دنیا الگ بنائی۔

لیکن ان اتنے سارے مردوں میں کوئی تو یہ بھی تو ویسا نہیں مرد جو کہ صرف اپنا ہو۔ اچھا ہو یا برا ہو۔

یہ معطر... خوشبودار مہذب... مودب، یہ مرد... یہ تو... اور تو! تو...!

افوہ! کبھی کبھی اسے اپنے جسم سے گھنے آنے لگتی۔ اس کو یوں محسوس ہوتا۔ اس کے جسم پر کوزہ ہو گیا ہے۔ سیاہ دھبے پڑے گئے ہیں۔ وہ خوبصورت ملائم سنگ مرمر ایک جسم اسے دغا دار و بد بودار لگتا۔ اس کا دل چاہتا جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اس کا قیہ کر دے اور اپنے لیے پھر سے ایک نیا جسم لے آئے۔ کورا مقدس پاک صاف مگر کہاں سے لے آئے۔

کے پیچھے پیچھے وہ کم صورت اور عام سی برقعہ پوش عورت بھی چلی گئی۔

نہ وہ چونکا نہ کھٹکا نہ حیران ہوا۔ نہ اس کی نظر میں پیمانہ کی کوئی کرن جاگی۔ نہ اس کے ماتھے پر پچھتاوے کا پسینہ آیا۔ نہ وہ احساس کی تپش سے ہولکھایا نہ احساس کمتری کے جھٹکوں سے لڑکھڑایا۔

وہ تو ویسا ہی تھا 'مطمئن' خاموش اپنے آپ میں مگن اسے اپنے پھونے پن کا احساس ہی نہ تھا۔ وہ تو ایک مرد تھا ایک کمزور عورت کا شوہر جو رات کو گھر کے دروازے بند کیے بغیر اطمینان سے سو جاتی تھی۔ جس نے ساری ذمہ داریاں شوہر پر ڈال رکھی تھیں اور جسے اپنے معمولی پن کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔

اور وہ کہ ملک کی اتنی بڑی ذکاوت تھی۔ مشہور و معروف ماڈل گرل تھی۔ وہ سڑک پر جا رہی ہوتی تو ٹریفک رک جاتا۔ لوگ اس کے نام کے نعرے لگاتے تھے۔ اس پر پھول بھینکتے تھے۔ اس کی نئی فلم ریلیز ہونے والی تھی۔ جگہ جگہ اس کے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے اور اس کو ایک معمولی سے درجہ دوم قسم کے انسان نے نہیں پہچانا تھا۔

وہ اپنے بچے اور بیوی کی دنیا میں گم تھا۔ اس سے گھڑنے کا اسے ذرا بھی ملال نہ تھا۔
”ہاں تم اپنا کیریئر بنالوگی۔ سب کچھ حاصل کر لوگی۔ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاؤ گی۔ مگر پھر بھی تم جی دامن رہو گی شہو۔ اتنے زیادہ جانے والوں کے باوجود کوئی تمہارا اپنا نہ ہوگا۔ سب تمہیں منڈی میں پڑا ہوا بکاؤ مال سمجھیں گے۔ مگر اپنے دل کے گوشے کو کوئی تمہاری یاد سے منور نہ کرنا چاہے گا۔ کیونکہ کسی کو بھی تمہارے مستقبل سے دلچسپی نہ ہوگی۔ تمہارے انجام کا احساس نہ ہوگا۔ سب تمہارے حال کے ساتھ ہی ہوں گے اور مستقبل سے تم ہمیشہ خوفزدہ رہو گی۔ تمام زندگی تم تنہائی کی آگ میں سٹگی رہو گی۔ بھری بزم میں تم تنہا رہو گی۔ روپے پیسے اور اطلس و کم خواب کی رم جھم میں بھی تمہاری روح پر ایک سناٹا طاری رہے گا اور یہ روح کا

سناٹا تمہارا جینا دو بھر کر دے گا۔“

روح کا سناٹا۔ او ایس کے کہے ہوئے آخری الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

اس نے انتہائی تیش کے عالم میں سڑک پار کی۔ آج اس نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی کہ کتنے لوگ موٹریں روک روک کر اسے شوقیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ غصے میں تسمائی موٹر کار کا دروازہ کھول کر سیٹرنگ کے آگے بیٹھ گئی۔

موٹر کار اشارت کرنے سے پہلے ایک بار پھر اس نے سڑک کے پار دیکھا کہ شاید اپنی خفت مٹانے کے بعد وہ اب اس کو مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہو پچھانے کی کوشش کر رہا ہو۔
آج اس بھری دنیا میں اس کی دولت اس کا شیش اور اس کا سن مل کر بھی اس لنگڑے آدمی کو نہیں خرید سکتے۔ وہ لنگڑا آدمی جو تمام تر اس کا تھا روح کا سناٹا اس کا دل چینا۔

اس نے موٹر میں جا بیٹھی۔

خوہد ابراہیم یتیم کی شکل بنائے دوسری طرف سے آکر انتہائی تابعداری سے اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سارے پلندے اس نے پچھلی سیٹ پر گرا دیئے۔ تو اس نے یوں مجھ سے انتقام لیا۔

موٹر اشارت ہو گئی۔

روح کا سناٹا..... جیسے اس کی چیخ کبہ رہی ہو۔

”بعض مرد بڑے بزدل ہوتے ہیں۔“ شرارہ نے دور سے نظر آتے ہوئے ایک دھبے پر نظریں جما کر کہا۔

”جی ہاں“ خوہد ابراہیم نے غلامانہ انداز میں تائید کی۔

”جو بچہ نہیں فوراً کرنا چاہے نہیں کر سکتے“

”کیسے ہوتے ہیں! الو کے پٹھے ہوتے ہیں۔“ وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

”جی ہاں ... جی ہاں“ خواجہ صاحب نے بھی اسی طرح کہا۔ وہ خواجہ صاحب کی موجودگی سے چونکی۔ ایک حقیر آلود نگاہ ان پر ڈال کر بولی۔

”وہ میرے پاسپورٹ کا کیا بنا؟“

”اور ویزا؟“

”وہ بھی مل جائے گا۔“

”ٹھیک ہے اگلے ہفتے میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

”جی..... جی..... جی“ خوشی کے مارے خواجہ صاحب تھوک نگلنا بھول گئے اور وہ

ہونٹوں کے کناروں سے باہر جھانکنے لگی۔ انہیں اپنی خوش بختی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

مونٹریک پر ریٹکے لگی۔ اس نے گیزر لگایا۔

”روح کا سناٹا“

پھر گیزر بدلا۔

”روح کا سناٹا“

ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھا۔

”روح کا سناٹا“

کار بے تحاشہ مونٹریک پر دوڑنے لگی۔

اور پرزہ پرزہ جیسے چیخنے لگا۔

”روح کا سناٹا“

”روح کا سناٹا“